سلسلہ نمبر۔۱۷

احمد جمال پاشا

ڈاکٹر ظفر کمالی

حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

Monograph-17

Ahmad Jamal Pasha

By : Dr. Zafar Kamali

احمد جمال پاشا بہار میں اردو طنز وظرافت کا ایک نمایاں اور اہم نام ہے۔ ویسے تو صحافت سے بھی اُن کا گہرا اور طویل رشتہ رہا۔ وہ ''اودھ پنچ'' اور ''قومی آواز'' لکھنؤ سے کافی عرصے تک منسلک رہے۔ لیکن ان کا اصل میدان طنز وظرافت ہی تھا۔

احمد جمال پاشا ادبی اعتبار سے ایک غیر متنازع اور قابلِ احترام شخصیت کے مالک رہے۔ اُن کا اصل نام نزہت پاشا تھا۔ اُن کا آبائی وطن اُتر پردیش کے ضلع الہٰ آباد کا قصبہ خلدآباد ہے، جہاں ۱ر جون ۱۹۳۲ء (اسکول ریکارڈ کے مطابق) کو اُن کی پیدائش ہوئی تھی۔ شروع میں انھوں نے صحافت کو اپنا میدانِ عمل بنایا۔ لیکن ۱۹۷۶ء میں جب اُن کا تقرر بحیثیت لکچرر بہار کے معروف ضلع سیوان کے ''ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج'' میں ہوا تو درس وتدریس کے ساتھ اُن کا رشتہ ادب سے زیادہ مستحکم ہوگیا۔ ادب کے حوالے سے احمد جمال پاشا نے طنز وظرافت نگاری کو اپنا میدانِ عمل بنایا۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے خاکہ نگاری، کالم نگاری اور تنقید نگاری میں بھی اپنے قلم کا جوہر دکھایا۔ اُن کا اختصاص یہ بھی ہے کہ انھوں نے بچوں کے ادب پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں 'بہادر ٹمبا'، 'دنیا کی لوک کہانیاں'، 'بالشتیے کی گھنٹی'، 'طلسمی کتا' قابلِ مطالعہ ہیں۔ اُن کی دیگر ادبی کتابوں میں 'اندیشہ شہر'، 'ستم ایجاد'، 'لذّتِ آزار'، 'مضامین پاشا'، 'چشم حیراں'، 'پتیوں پر چھڑکاؤ'، 'تماشائے ادب'، 'شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت'، 'ظرافت اور تنقید' وغیرہ اُن کی روشن نگارشات ہیں۔

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر ظفر کمالی ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج، سیوان کے شعبۂ فارسی میں بحیثیت استاد اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک شاعر اور محقق کے طور پر انھوں نے ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ان کا میدان عمل بھی طنز وظرافت اور بچوں کا ادب ہے۔

ڈاکٹر ظفر کمالی، احمد جمال پاشا کے عزیز ترین شاگرد رہے ہیں۔ ادبی تعلق کے علاوہ اُن سے گھریلو مراسم بھی رہے۔ لہٰذا پاشا صاحب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے اور پرکھنے کے مواقع اُنھیں ملتے رہے۔ اس اعتبار سے ظفر کمالی کا احمد جمال پاشا پر تصنیف کردہ یہ فردنامہ سندِ اعتبار کا حامل ہے اور 'پاشا شناسی' کے باب میں ایک کامیاب پیش کش ہے۔

— اسلم جاوداں

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

احمد جمال پاشا

ڈاکٹر ظفر کمالی

طابع و ناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۱۷

Ahmad Jamal Paasha

By

Dr. Zafar Kamali

نام کتاب	:	احمد جمال پاشا
مصنف	:	ڈاکٹر ظفر کمالی
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	136
کمپوزنگ	:	عبدالوہاب قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔ ٦

ملنے کا پتہ:

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

پیشِ لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	ڈاکٹر ظفر کمالی	6
احمد جمال پاشا: ایک نظر میں	—	9
شخصی تعارف	—	13
تصنیفات وتالیفات	—	26
ادبی خدمات		
(الف) مضمون نگاری	—	32
(ب) تحریف نگاری	—	42
(ج) خاکہ نگاری	—	56
(د) کالم نگاری	—	65
(ہ) تنقید نگاری	—	74
احمد جمال پاشا کی مزاحیہ صحافت ''اودھ پنچ'' کے حوالے سے	—	95
انتخابِ نگارشات		
۱۔ گلّی ڈنڈے پر سیمنار (مزاحیہ مضمون)	—	102
۲۔ کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (پیروڈی)	—	110
۳۔ کلیم الدین احمد (خاکہ)	—	116
۴۔ فنِ لطیفہ گوئی (تنقید)	—	125

پیشِ لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری وادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعروادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد،، بیدلؔ عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری وادبی عظمت واہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری وادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعروادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشورانِ شعر و ادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام اثرؔ، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوقؔ نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراںؔ، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدا بخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخؔ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

احمد جمال پاشا کا نام دبستان بہار کے طنز و مزاح نگاروں میں بہت نمایاں ہے۔ ابتدا میں ان کا تعلق صحافت سے رہا، لیکن اس کے بعد انھوں نے طنز و مزاح نگاری کو خدمت ادب کا وسیلہ بنا لیا اور اس شعبے میں اپنی اہمیت ثابت کر دی۔ انھوں نے بچوں کے لئے بھی کئی کامیاب کتابیں تصنیف کیں اور ادب اطفال میں بھی اپنا مقام بنایا۔

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر ظفر کمالی، سیوان کے ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج کے شعبہ فارسی میں استاد ہیں، جہاں احمد جمال پاشا بھی تدریس کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ ظفر کمالی کا رشتہ ان سے بے حد قریبی اور گہرا رہا ہے۔ لہٰذا یہ فردنامہ معتبر اور مستند تصنیف کے زمرے میں آئے گا۔

اردو ڈائرکٹوریٹ اعتماد کے ساتھ یہ فردنامہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

آزادی کے بعد اردو ظرافت کے افق پر نمودار ہونے والے اہم ظرافت نگاروں میں احمد جمال پاشا کا نام بے حد اہم ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء سے لکھنا شروع کیا اور تقریباً چالیس برسوں تک قلم و قرطاس سے ان کا رشتہ مضبوطی کے ساتھ قائم رہا۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے مشہورِ زمانہ ظریف اخبار ''اودھ پنچ'' کے تیسرے دور کا آغاز کیا اور ۱۹۶۱ء میں قومی آواز'' لکھنؤ کے شعبۂ ادارت میں شامل ہوئے اور ۱۹۷۶ء کے نصف اول تک اس سے جڑے رہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ادب کے ساتھ ساتھ صحافت سے ان کا اہم رشتہ تھا۔ ۱۹۷۶ء میں جب یہ اسلامیہ کالج سیوان کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے تو درس و تدریس اور ادب سے ان کا تعلق اور مستحکم ہو گیا۔ انھوں نے تسلسل کے ساتھ ظریفانہ مضامین لکھے اور ان کے متعدد مجموعے شائع کرائے۔ ظریفانہ مضامین کے علاوہ انھوں نے کالم نگاری، خاکہ نگاری اور تحریف نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے، بچوں کے لیے بھی لکھا اور متعدد چھوٹے بڑے تذکرے بھی قلم بند فرمائے۔

احمد جمال پاشا زندگی بھر ادبی سیاست کی ریشہ دوانیوں سے دور رہے اور گوشۂ ادب میں بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ ادبی خدمات انجام دینے کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ انھوں نے اس کی قیمت بھی چکائی۔ ''پتیوں پر چھڑکاؤ'' کی اشاعت کے بعد جب یہ اپنی تحریروں کی ترتیب و تدوین میں پوری تن دہی کے ساتھ مصروف تھے کہ اچانک ان کا انتقال ہو گیا اور ان کے تمام ادبی منصوبے ادھورے رہ گئے۔ ان کی تحریروں کے جتنے مجموعے شائع ہوئے تقریباً اتنی مزید کتابیں تشنۂ طباعت رہ گئیں اور ان کی موت کے تینتیس برس گزر جانے کے بعد بھی ان کے ورثا کو اس جانب توجہ کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ لہٰذا موجودہ صورت میں ادبی دنیا احمد جمال پاشا کی مکمل ادبی خدمات سے واقف نہیں۔ جب تک یہ تمام تحریریں شائع نہیں ہو جاتیں ہم احمد جمال پاشا کے فن کا مکمّل ادراک نہیں کر سکتے لیکن ان کی جتنی چیزیں

منظرِ عام پر آئی ہیں ان کی روشنی میں بھی ان کی ادبی کاوشیں نہایت قابلِ قدر ہیں۔

احمد جمال پاشا کے وصال کے بعد ان کی حیات وخدمات پر کئی درس گاہوں میں تحقیقی کام ہوئے لیکن سید معصوم رضا کے ایم فل کے مقالے ''اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا'' کے علاوہ کوئی دوسرا مقالہ شائع نہیں ہوسکا۔ جاوید اقبال نے مختلف اصحاب کے مضامین پر مشتمل ''احمد جمال پاشا، شخصیت اور فن'' کے نام سے مرتبہ اپنی کتاب طبع کرائی۔ راقم الحروف کی کتاب ''متعلّقاتِ احمد جمال پاشا'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسا کام سامنے نہیں آیا جو پاشا صاحب کی ادبی خدمات کا وسیع احاطہ کر سکے۔

کسی بھی شخصیت پر لکھے جانے والے فردنامے کی اپنی حدیں ہوتی ہیں۔ ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ کسی بھی پہلو پر تفصیل سے گفتگو کی جا سکے۔ پیشِ نظر فردنامہ اپنی حدود وقیود میں رہتے ہوئے قلم بند کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے پاشا فہمی کی راہیں روشن ہونے میں تھوڑی مدد ضرور ملے گی۔ میں اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومتِ بہار پٹنہ کے اربابِ حل وعقد کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے اس اہم کام کا موقع فراہم کیا۔

ظفرؔ کمالی
سیوان (بہار)
۳؍نومبر ۲۰۲۰ء

فردنامہ : احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا: ایک نظر میں

اصل نام	محمد نزہت پاشا
عقیقے کا نام	آغا محمد نصرت پاشا
قلمی نام	احمد جمال پاشا
تاریخِ پیدائش	۱۹۲۹ء (۱؍جون ۱۹۳۶ء اسکول ریکارڈ کے مطابق)
جائے پیدائش	خلد آباد، الہٰ آباد، اتر پردیش
والد کا نام	آغا شجاعت حسین
والدہ کا نام	سروری خاتون
دادا کا نام	ولایت علی ابن نجف علی
دادی کا نام	لطیفن بی بی
نانا کا نام	سید معز الدین
نانی کا نام	شمشاد خاتون
بسم اللہ خوانی کی رسم	۱۹۳۲ء میں تین سال کی عمر میں مولوی زکریا کے ہاتھوں بچپن میں گھر پر
پڑھانے والے اساتذہ	مولوی زکریا، انگریز گورنس مس نیوٹن، پنڈت شیو شنکر، ذکی رسول پوری
بھائی بہن	محمد عزّت پاشا، ثروت پاشا، کمال پاشا، اقبال پاشا، ثریا خاتون، رئیسہ خاتون۔ (گیارہ بھائی بہنوں کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا)
سوتیلے بھائی بہن	شوکت، رفّو
زائچہ تیار کرنے والا نجومی	ڈاکٹر منجیت سنگھ عرف شاہی نجومی
الہٰ آباد سے لکھنؤ آمد	۱۹۴۰ء
سکونت	محلّہ امین آباد، کچّا احاطہ ''سروری منزل''

میٹرک	۱۹۵۰ء کوئنس ہائی اسکول لکھنؤ
انٹرمیڈیٹ	۱۹۵۳ء لکھنؤ کرسچین کالج
بی۔اے	۱۹۵۶ء لکھنؤ یونیورسٹی
ایم۔اے	۱۹۵۸ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ میں قیام	ایس۔ایم ایسٹ سرسید ہال کمرہ نمبر ۱۴۳
روم پارٹنر	سعید حسن، یہ جموں کشمیر کے سابق وزیر اعلا میر قاسم کے بڑے بھائی تھے اور بڑھاپے میں قانون کی اعلا تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔
ہم جماعت	محمد مثنیٰ انور، عبدالقیوم (سابق وزیر تعلیم جموں کشمیر)، مشہور ٹینس کھلاڑی احمد بھائی، پی۔ کے محمد، حبیب احمد صدیقی، نیّر اقبال، احمد حسین، شیخ سلیم احمد، محمود ایوبی، روشن آرا (بیگم ڈاکٹر محمد حسن) جمال آرا، شمیمہ علیگ، آلِ احمد سرور کی صاحب زادی مہ جبیں، شریف احمد، وقار مشرقی، عبدالجلیل وغیرہ۔
یونیورسٹی کے اہم احباب	قاضی عبدالستار، قمر رئیس، انور صدیقی، محمود الٰہی، راہی معصوم رضا، شہریار، سید امین اشرف، تنویر احمد علوی، رضوان حسین، ابنِ فرید، اقبال مجید، شہاب جعفری، اسحاق نعمانی، محمد صدیق، عثمان غنی، کاظم علی خاں، امیر عارفی، نجم الحسن، بلدیو مرزا، شاہد مہدی، قاضی غلام محمد، تجمل حسین۔
اساتذہ جن سے قریبی تعلقات تھے	معین احسن جذبی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی، ڈاکٹر ابوسالم، مسعود علی ذوقی، نسیم قریشی۔
جن درباروں میں بہت احتیاط سے جانا ہوتا تھا	پروفیسر رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور، خورشید الاسلام، مسعود حسین خاں، پروفیسر نورالدین، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر محمد وزیر، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر خلیق احمد نظامی، کرنل بشیر حسین زیدی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ظہیر الدین علوی اور اختر انصاری۔
علی گڑھ میگزین کی مجلسِ ادارت میں شمولیت	۱۹۵۸ء نگراں رشید احمد صدیقی، ایڈیٹر انور صدیقی
پیروڈی کانفرنس کا انعقاد	۱۹۵۷ء۔ اپنی ادارت میں سرسید ہال میگزین ''اسکالر'' کا پیروڈی نمبر بھی نکالا۔
''اودھ پنچ'' کا اجرا (تیسرا دور)	اگست ۱۹۵۹ء لکھنؤ (کل تیرہ شمارے شائع ہوئے)

”قومی آواز“ لکھنؤ سے وابستگی : ۱۹۶۱ء میں حیات اللہ انصاری نے جو قومی آواز کے ایڈیٹر تھے، انھیں اخبار کے شعبۂ ادارت میں شامل کیا جس سے وہ جولائی ۱۹۷۶ء تک وابستہ رہے۔

شادی (دوسری) : ۱۱؍فروری ۱۹۶۶ء کو سیوان (بہار) میں سرور جہاں عرف بکاؤلی سے۔ پہلی بیوی کا نام نکہت مہتاب تھا۔ دونوں میں علاحدگی ہوگئی تھی۔ اس شادی کی دیگر تفصیلات معلوم نہیں ہوسکیں۔

خسر کا نام : حاجی محمد داؤد

خوش دامن کا نام : اکبری خاتون

اسلامیہ کالج سیوان میں اردو استاد کی حیثیت سے تقرری : ۱۹۷۶ء

ادبی زندگی کا آغاز : ۱۹۵۰ء

پہلا مضمون : نمکین داروغہ (یہ منشی پریم چند کے افسانے ”نمک کا داروغہ“ سے سرقہ کیا گیا تھا)

پہلا باضابطہ مضمون : بڑے میاں

آخری مضمون : آنکھیں ترستیاں ہیں (مجازؔ لکھنوی)

ظرافت کے فن سے آشنا کرنے والی تین شخصیات: پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن، عابد سہیل

لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ جنھوں نے ان کی مزاح نگاری کی حوصلہ افزائی کی : پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر یوسف حسین موسوی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، رضیہ سجاد ظہیر اور سید شبیہ الحسن نونہروی۔

تصانیف کے نام : ۱۔اندیشہ شہر، ۲۔ ستم ایجاد، ۳۔لذّتِ آزار، ۴۔مضامینِ پاشا ۵۔ چشمِ حیراں، ۶۔شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت، ۶۔ظرافت اورتنقید، ۷۔مجاز کے لطیفے، ۸۔غالب سے معذرت کے ساتھ، ۹۔اردو کے چار شاعر، ۱۰۔اردو کے پانچ مزاحیہ شاعر، ۱۱۔مُلّا نصر الدین کے لطیفے، ۱۲۔ہجویاتِ میر، ۱۳۔ نذرِ حمید، ۱۴۔ ہماری نظمیں، ۱۵۔ بہادر ٹمبا، ۱۶۔ دنیا کی لوک کہانیاں، ۱۷۔ بالیشتے کی گھنٹی، ۱۸۔ طلسمی کتا، ۱۹۔ آسمانی یاقوت، ۲۰۔

اعزاز و انعامات : اتر پردیش اردو اکادمی نے ”مضامینِ پاشا“ اور ”چشمِ حیراں“ پر انعامات دیے۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے ”ظرافت اور تنقید“ پر انعام دیا۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ نے ”پتیوں پر چھڑکاؤ“ پر اختر اورینوی انعام (بعد از مرگ) عنایت کیا۔ ۱۹۸۴ء میں سیوان میں ہندی ادیبوں کی ایک تنظیم نے ”یوگ مایا ساہتیہ پرسکار“ دیا۔ اپریل ۱۹۸۶ء الٰہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کے اجتماع میں انھیں ”نشانِ سجاد ظہیر“ ملا۔ غالب اکیڈمی دہلی کی جانب سے ۱۹۸۶ء کا ساگر سوری غالب انعام برائے اردو طنز و مزاح (پسِ مرگ) دیا گیا۔

پاکستان کا سفر : ۱۹۸۴ء بیگم سرور جمال کے ہمراہ

حج کا سفر : ۱۹۸۶ء

سفرِ حج سے سیوان واپسی: ۲۳؍ستمبر ۱۹۸۶ء

دل کا دورہ : ۲۷؍ستمبر ۱۹۸۷ء پٹنہ پروفیسر اعجاز علی ارشد کے دولت کدے پر

انتقال : ۲۸؍ستمبر بروز پیر (۴؍صفر المظفر ۱۴۰۸ھ) نو بج کر بیس منٹ پر اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی کے آئی۔سی۔سی یونٹ میں۔

نمازِ جنازہ : ۲۹؍ستمبر ۱۹۸۷ء کو کوٹھی نشاط افزا، سیوان کے لان میں مولانا اقبال احمد مظاہری نے پڑھائی۔

تدفین : سیوان کے مرچائی شاہ تکیہ سے متصل پچھّم جانب سسرال کے آبائی قبرستان میں۔

شخصی تعارف

احمد جمال پاشا ایک عالی نسب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے دادا میر ولایت علی اور والد آغا شجاعت حسین کا شمار اپنے زمانے کی اہم شخصیات میں ہوتا تھا۔ولایت علی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور کئی انگریزوں کو مار ڈالا۔وہ شاعر بھی تھے اور خاورؔ تخلص کرتے تھے۔اکبراللہ آبادی اور ریاض خیرآبادی کچھ دنوں تک ان کے یہاں رہے۔شجاعت حسین نے لندن سے قانون کی اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔انھوں نے منصفی کا امتحان بھی پاس کیا۔وہ پہلے متھرا میں ایڈیشنل جج ہوئے اور کئی برسوں تک ریاست بھوپال میں مدارالمہام رہے۔وہ برٹش گورنمنٹ میں سیاسی ایجنٹ بھی رہے اور انڈمان نکوبار میں چیف کمشنر بھی بنائے گئے۔کچھ دنوں تک کورٹ آف وارڈز میں رہنے کے بعد یادِ الٰہی میں زندگی بسر کرنے کے لیے کسی بھی عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ان پر مذہب کا غلبہ گہرا ہوتا گیا تو انھوں نے مولانا عامر عثمانی ایڈیٹر ''تجلی'' کے والدِ محترم کے ہاتھ پر بیعت کی جو اپنے زمانے کے صاحبِ حال وقال بزرگ تھے۔ان پر جذب کے دورے پڑنے لگے۔مزارات پر حاضری چلّہ کشی میں تبدیل ہوگئی۔کچھ دنوں کے بعد پیر کے حکم سے یہ الہ آباد آ گئے اور محلّہ خلد آباد میں رہ کر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔

شجاعت حسین کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔پہلی شادی بھوپال میں بابو عبدالقادر چیف انجینیر کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ان کے انتقال کے کئی برس بعد دوسری شادی بریلی میں سید معزالدین کی صاحب زادی سروری خاتون سے ہوئی۔ان کے بطن سے اٹھارہ بچے تولد ہوئے لیکن سات کے علاوہ بقیہ بچے کم عمری میں انتقال کر گئے۔

احمد جمال پاشا نے اپنے سالِ پیدائش کے سلسلے میں متضاد باتیں کہی ہیں۔ان کی اسکولی سند میں یکم جون ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے لیکن مختلف جگہوں پر انھوں نے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۰ء کی تاریخیں بھی بتائی ہیں لیکن راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق وہ ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ان کا اصل نام محمد نزہت پاشا

تھا۔ادبی میدان میں قدم رکھنے کے بعد پروفیسر سید احتشام حسین کے مشورے سے احمد جمال پاشا کا قلمی نام اختیار کیا۔

جمال صاحب کی پیدائش کے بعد ان کے والد نے اس زمانے کے مشہور نجومی منجیت سنگھ سے ان کا زائچہ تیار کرایا تھا۔منجیت سنگھ نے جو شاہی نجومی کے نام سے مشہور تھے، یہ پیشن گوئی کی کہ یہ لڑکا بڑا ڈاکو نکلے گا یا بڑا آدمی ہوگا مگر ہر حالت میں نام پیدا کرے گا۔

پاشا صاحب بچپن میں بے حد شریر تھے۔پورا گھر ان کی شرارتوں سے عاجز رہتا۔والد ذرا بھی شکایت سنتے تو فوراً ان کی پٹائی کرتے۔ان کی شرارتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ یہ اپنے گھر میں چوریاں کرنے لگے۔اپنے دوستوں کی چیزیں بھی زبردستی چھین لیتے۔اس چھینا جھپٹی کی اطلاع جب ان کے والد کو ملتی تو ان کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا، انھیں نجومی کی پیشن گوئی یاد آ جاتی اور وہ انھیں ضرور سزا دیتے۔وہ چوروں، ڈاکوؤں، لٹیروں اور ٹھگوں کی کتابیں فٹ پاتھ سے خریدتے اور انھیں چھپ چھپ کر پڑھتے۔ان کے چھوٹے بھائی اقبال پاشا نے اپنے مضمون ''جمال کی چیخیں اور اردو'' میں ہر ہفتے پاشا صاحب کی کتابیں جلائے جانے اور ان کی کٹائی کا ڈرامائی منظر بڑے موثر پیرایے میں بیان کیا ہے۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ احمد جمال پاشا کی شرارتوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ ان میں گہرائی کے ساتھ پختگی پیدا ہوتی گئی۔ان کے مرنے کے بعد ان کے دوستوں اقبال مجید، عابد سہیل اور رتن سنگھ نے ان پر جو شخصی مضامین لکھے ہیں ان میں ان کی شوخیوں کا بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔

احمد جمال پاشا کی شخصیت بہت دلفریب تھی۔جیسے جیسے ان کی عمر میں اضافہ ہوتا گیا فطری طور پر ان کی شخصیت میں بھی تغیر رونما ہوتا رہا۔بچپن سے ان کے مزاج میں جو شوخی تھی وہ کسی نہ کسی شکل میں آخر تک برقرار رہی۔اسکول سے کالج تک ان کی زندگی مختلف ہنگاموں سے عبارت ہے۔دوستوں کے درمیان رزم و بزم کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔بعض اوقات جب معاملہ بگڑنے لگتا تو دوستوں میں سے ہی کوئی صلح صفائی کرا دیتا اور پھر یہ باہم چہکنے لگتے۔احمد جمال پاشا اور ان کے دوستوں میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ سب یاروں کے یار تھے۔یہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے، بحثیں کرتے لیکن سب کے دل میں ایک دوسرے کے تئیں خلوص کا جذبہ تھا۔جہاں سود و زیاں کا چکر نہ ہو، ذاتی مفادات درمیان میں نہ آتے ہوں، ابن الوقتی اور خود غرضی کا گزر بسر نہ ہو، سبھی انانیت سے دور ہوں، ویسی بزم سے اگر اخوت و محبت کے نغمے نہیں پھوٹیں گے تو اور کیا ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ پاشا صاحب اور ان کے دوستوں

کی محفل میں جہاں ایک طرف کوئی چوٹی کے وکیل کا بیٹا نظر آتا ہے، کوئی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے وہیں دوسری جانب کچھ دوست ایسے بھی ہیں جن میں کوئی ٹیوشن پڑھا کر پڑھ رہا ہے تو کوئی رکشہ چلا کر۔ اس کے باوجود اس محفل میں من وتو کا امتیاز نظر نہیں آتا۔

احمد جمال پاشا ہر چند ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے والد چونکہ ڈسپلن کے سخت پابند تھے اس لیے وہ لڑکوں کو ان کی جائز ضروریات سے زیادہ پیسے دینے کے حق میں نہیں تھے کہ اس سے فضول خرچی کی عادت پڑنے کا اندیشہ تھا۔ اس تنگی کے عالم میں بھی پاشا صاحب اپنے ضرورت مند دوستوں کی حتی المقدور مدد کیا کرتے تھے۔

بذلہ سنجی پاشا صاحب کے مزاج کا خاصہ تھی۔ گھر، دفتر یا بزمِ احباب، وہ چاہے جہاں کہیں بھی ہوں ظرافت کے شرارے چھوٹتے رہتے تھے۔ دوسروں پر جملے چپکاتے، خود جملے سہتے، چھیڑ چھاڑ میں بعض اوقات بزرگ بھی لپیٹ میں آجاتے تھے۔ ''قومی آواز'' میں کام کرنے والوں میں محمد حسن قدوائی مرحوم جیسا نستعلیق شخص بھی تھا۔ پاشا صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر بعض اوقات ان کے دوپہر کے کھانے میں سے اچھی چیزیں چوری چھپے کھا جاتے اور برائے نام چھوڑ دیتے۔ قدوائی صاحب معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچتے ہوئے جب کبھی بیگم کو سخت سست سنانے لگتے تو یہ لوگ مزا لیتے اور ان سے اظہارِ ہمدردی کرتے۔ پاشا صاحب نے بقول عثمان غنی ایک مرتبہ قومی آواز میں اپنے استاد ڈاکٹر احسن فاروقی کی عقل ڈاڑھ نکلنے کی خبر شائع کردی جس کی وجہ سے حیات اللہ انصاری ان پر سخت برہم ہوئے۔ آخر کار بڑی مشکلوں سے نور فاروقی، عبدالمجیب سہالوی اور محمد حسن قدوائی نے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔

احمد جمال پاشا فرشتہ نہیں تھے ان میں بھی وہ بشری کمزوریاں موجود تھیں جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں لیکن وہ دوہرے کردار کے مالک نہیں تھے۔ جو ان کے دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی رہتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جن کی خوابگاہوں میں مخملی بستر اور ڈرائنگ روم میں قیمتی قالین بچھے ہوتے ہیں لیکن دل کے دروازے پر نگاہ ڈالیے تو ٹاٹ کے پردے ٹنگے دکھائی دیں گے۔

پاشا صاحب جب لکھنؤ سے سیوان آئے تو ان کے مزاج میں کافی تغیّر رونما ہو چکا تھا۔ عمر اور زندگی کے گوناگوں تجربات نے انھیں شعور کی وہ دولت عطا کردی تھی جس کے سہارے وہ حقائق سے کہیں بہتر ڈھنگ سے آنکھیں چار کرسکتے تھے۔ وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ہر ذی شعور شخص کو زندگی کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سیوان کے احمد جمال پاشا لکھنؤ کے پاشا سے

یکسر مختلف نظر آتے ہیں۔ ۷۷ء سے ۸۷ء تک کی ان کی زندگی میرے لیے شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ تھی۔ اس مدت میں انھیں ہر رنگ میں دیکھا۔ ذیل کی سطور میں پاشا صاحب کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ مذکور ہوگا ان میں بیش تر میرے ذاتی تجربات ہوں گے۔

کہاں لکھنؤ اور کہاں سیوان، جیسے کسی نے شہرِ نگاراں سے رخصت ہو کر شہرِ بے کساں میں پناہ لی ہو۔ لکھنؤ کی شام اگر شامِ اودھ تھی تو یہاں شامِ غریباں کا منظر دیکھنے کو ملا۔ وہاں بہار کا سماں اور بلبلوں کی زمزمہ سنجی تھی تو یہاں خزاں رسیدہ چمن میں کوّوں کا شور تھا۔ وہاں صبا کا خنک پن تو یہاں بادِ سموم کے جھونکے تھے۔ بوڑھے درخت اکھڑنے کے بعد جڑ نہیں پکڑتے۔ پاشا صاحب نے چھوڑنے کو لکھنؤ چھوڑ دیا لیکن وہ ہمیشہ فرقتِ احباب میں ملول رہے۔ بہ ظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا لیکن اندر ہی اندر لکھنؤ کی یاد ان کے دل پر ہمیشہ نشتر زنی کرتی رہی۔ وہ خود کو وہاں کا باسی سمجھتے اور اس پر فخر کرتے رہے۔ سیوان میں ناقدروں کے درمیان رہ کر بھی انھوں نے میر انیسؔ کی طرح ''ہائے لکھنؤ! میں تجھے کہاں سے لاؤں'' کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ انھوں نے خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور زیادہ سے زیادہ وقت تخلیقی کاموں میں صرف کرنے لگے۔ ان کی شریکِ حیات سرور جمال نے انھیں گھریلو ذمّے داریوں سے بے نیاز کر رکھا تھا تاکہ ان کے ذہن پر کسی طرح کا بار نہیں پڑے اور وہ آزادی کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مشغول رہیں۔ اس کے باوجود جس دل جمعی کے ساتھ انھیں کام کرنا چاہیے تھا وہ نہیں کرسکے۔ کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ انھیں تو قوم کا روگ لگ چکا تھا۔ طلبہ کو ملک کا مستقبل اور قوم کی امانت تصور کرتے اور اساتذہ کو ان کی شخصیت کا معمار۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھ پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میرے طالب علموں کا حق ہے۔ ان سے جو وقت بچے گا اسی میں دوسرے کام ہوں گے۔ کلاس میں جسے دیکھتے کہ ذرا شین قاف درست ہے اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ بہلا پھسلا کر گھر پر بلاتے، چائے کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے، چھیڑتے تاکہ بے تکلفی کی فضا پیدا ہو جائے اور شاگردوں کے دل میں ان کی شخصیت کا جو رعب ہے وہ دور ہو جائے پھر اسے باری باری سے بچوں کی کہانیوں، افسانے، مضامین اور طنزیہ مزاحیہ ادب پر مشتمل مختلف کتابیں مطالعہ کے لیے دیتے۔ اگر دیکھا کہ طالبِ علم بچوں کی کہانیوں میں دلچسپی لے رہا ہے تو پہلے دس بیس کتابیں پڑھواتے پھر فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ''میاں گھروں میں دادی اماں سے جن بھوت، دیو پری، توتے مینے وغیرہ کی کہانیاں تو ضرور سنی ہوں گی۔ اب آئیے تو ان میں سے

دوایک لکھ لائیے'' اور اگر بندۂ خدا نے واقعی کوئی کہانی لکھ دی تو چاہے وہ جتنی خراب یا بچکانہ ہو اس کی یوں تعریف کرتے جیسے یہی اردو ادب کا شاہکار ہے۔ اکثر فرماتے کہ جس کی ایک چیز چھپ گئی سمجھو وہ پھنس گیا۔ لہٰذا کسی کی تخلیق کبھی پاکستان کے کسی رسالے میں شائع کرا دی تو کبھی ہندستان میں۔ تحریر رسالے کے لائق نہیں ہوئی تو اخبار کا پیٹ بھر دیا۔ تخلیق شائع ہونے کے بعد اس کی تشہیر کرتے تا کہ لڑکوں کا حوصلہ بلند ہو۔

عام طلبہ کے برخلاف ریسرچ اسکالروں کے ساتھ ان کا رویہ قدرے سخت رہتا تھا۔ اگر کوئی مقامی ریسرچ اسکالر آتا تو اسے مختلف بہانوں سے خوب دوڑاتے۔ ''کل آیئے گا، آج فرصت نہیں، ایک ہفتہ بعد ملیے، طبیعت ناساز ہے'' مقصد فقط ذوق کو آزمانا ہوتا۔ کہتے کہ کچھ لوگوں کو صرف پی ایچ۔ ڈی کہلانے کا شوق ہوتا ہے ان پر توجہ دینا وقت ضائع کرنا ہے۔ جس کے بارے میں یقین ہو جاتا کہ علم کی سچی لگن ہے تو پھر نوازشات کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ مختلف طریقے سے تحقیق کے اسرار و رموز سمجھاتے۔ ایک دو نہیں کارٹون بھر بھر کر کتابیں دیتے۔ ان کی اہلیہ احتجاج کرتیں کہ اتنی کتابیں ایک مرتبہ نہ دیا کیجیے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتے۔

پاشا صاحب کی کالج میں بہت دھاک تھی۔ ان کے علم کے سبھی معترف تھے۔ کالج جوائن کرنے کے برس ڈیڑھ برس تک وہ لڑکوں کو متاثر نہیں کر سکے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا معیار کچھ اتنا بلند ہوتا کہ طلبہ کے سروں سے گزر جاتا۔ انھیں جب اس کا احساس ہوا تو اپنے طریقے میں تبدیلی کی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ اپنے پیشے کے تئیں پوری طرح ایماندار تھے۔ جو پڑھانا ہوتا اسے پڑھے بغیر نہیں آتے تھے۔ کلاس میں خوب ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ پڑھائی کے دوران اس طرح فقرے چست کرتے کہ طلبہ لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ مضمون کی مناسبت سے لہجہ اختیار کرتے۔ لکچر کے بعد خاص خاص پوائنٹ نوٹ بھی کرا دیتے تھے۔

پاشا صاحب شاعری کے مقابلے میں نثر زیادہ بہتر پڑھاتے تھے۔ شبلی اور سرسید کو پڑھانے میں خاص ملکہ تھا۔ ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کالج میں علم و ادب کا ماحول پیدا کر دیا۔ طلبہ میں علم و ادب کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ''حلقۂ اربابِ ادب'' کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جلسے مہینے میں دو بار پاشا صاحب کے دولت کدے پر ہوتے تھے۔ ان میں شہر کے صرف منتخب شاعر اور ادیب شریک ہوتے جس کے لیے دعوت نامے بھیجے جاتے تھے۔ طلبہ کو آزادی تھی کہ جو آنا چاہے آئے۔ اسلامیہ کالج کے

لڑکے اس میں بہت پابندی اور جوش و خروش سے حصہ لیتے۔ ان میں جو تخلیقات پڑھی جاتیں ان پر جم کر بحث ہوتی۔ بحث و مباحثہ کی روشنی میں تخلیقات پر نظرِ ثانی کی جاتی۔ جلسے کے آخر میں شاعری کا دور شروع ہوتا اور اختتام پر چائے ناشتے سے تواضع کی جاتی۔

جمال صاحب اپنے شاگردوں کی چپکے چپکے مالی مدد کیا کرتے۔ کسی کی فیس جمع کراتے تو کسی کا فارم بھرواتے۔ کسی کو کاپی کتاب کے پیسے دیتے تو کسی کو آمد و رفت کے لیے بس کا کرایہ عنایت فرماتے۔ جو غریب طلبہ اسلامیہ کالج کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد (بشرطیکہ ذہین ہوں) ملک کی کسی دوسری یونیورسٹی میں پڑھنے جاتے انھیں بھی پابندی سے ہر مہینے روپے بھیجتے۔ منی آرڈر رسید اپنے ہاتھوں چاک کر دیتے یا جلا دیتے۔ اپنی تعریف سے بے حد گھبراتے تھے۔ اگر کوئی قصیدہ خوانی شروع کرتا تو سر جھکا لیتے۔ ایک صاحب سے ہنس کر پوچھا کہ آپ نے مبالغے کا یہ فن کہاں سے سیکھا''۔ تعلیم کے گرتے معیار کو دیکھ کر بہت فکرمند رہا کرتے تھے۔ پی ایچ۔ ڈی کے کارخانے کا تذکرہ سن کر چہرے کا رنگ اڑ جاتا۔ فرماتے کہ ''اساتذہ کی اکثریت کا ضمیر مردہ ہو گیا ہے۔ اس کا سدِّ باب نہیں کیا گیا تو انجام عبرت ناک ہوگا۔

کتابیں جمع کرنے کا پاشا صاحب کو ذوق نہیں جنون تھا۔ اس جنون میں مبتلا کرنے والے ان کے گہرے دوست اسلم محمود تھے۔ جہاں کہیں جاتے کتابوں کی دکان تلاش کرتے۔ گھنٹوں انہماک کے ساتھ ان کا معائنہ کرتے۔ کام کی کتابیں مل جاتیں تو اتنے خوش ہوتے گویا عید ہو گئی۔ جتنے ذوق سے کتابیں خریدتے اسی شوق سے ان کا مطالعہ بھی کرتے۔ خدانخواستہ کتاب خراب نکل گئی تو اسے پڑھتے جاتے ساتھ ہی زبان پر لاحول کا ورد جاری رہتا۔ کتابوں کی چوری کو جائز سمجھتے تھے۔ اس بارے میں ان کا مخصوص نظریہ تھا۔ فرماتے کہ اگر کسی پڑھنے لکھنے والے کے یہاں کتاب ہو تو کوئی بات نہیں لیکن کسی جاہل کے یہاں کوئی کتاب بے مصرف پڑی ہو اور اس کے ضائع ہو جانے کا یقین ہو تو اسے اڑا لینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچانا چاہیے۔ اس ضمن میں وہ اپنے مختلف کارناموں کا ذکر مزے لے لے کر سناتے لیکن کتابیں بانٹنے میں بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

جمال صاحب کے یہاں تعصب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حاجت روائی میں اپنے پرائے، ہندو مسلم کسی سے کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ وہ اردو کے استاد تھے لیکن ایسے غیر مسلم طلبہ کی بھی مدد کی جنھیں ان سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

پاشا صاحب کے مزاج میں بلا کی مروّت تھی۔ بہتیرے لوگ ان کا وقت ضائع کرتے لیکن وہ ا

ن کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ چپ چاپ بیٹھے ان کی سنتے اور ہوں ہاں کرتے رہتے کسی سے خفا بھی ہوتے تو بس یونہی۔لوگ مختلف طرح کی سفارشوں کے لیے حاضر ہوتے۔کسی کو کہیں داخلہ لینا ہے تو کسی کو نمبر بڑھوانا ہے۔کوئی لڑکی کا رشتہ طے کرانے آیا ہے تو کوئی نوکری کے لیے۔کوئی مشورہ کرنے حاضر ہورہا ہے تو کوئی صاحب اپنا خاندانی جھگڑا سلجھانے کے لیے تشریف لاتے۔لوگ مذہبی تقریبات،علمی وادبی مجالس اور شادی بیاہ میں لے جانے کی خاطر دباوڈالتے۔طبیعت ناساز بھی ہوتی تب بھی اخلاقاً شرکت کا وعدہ کر لیتے۔ان سے کسی کام کی پیروی کرانا بہت آسان تھا۔انکار کرنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔جو کام ان سے نہ ہوسکتا اس کے لیے حاجت مند کو اپنے کسی دوست کے پاس بھیج دیتے۔

پاشا صاحب کی شرافت ومروّت سے کچھ لوگوں نے ناجائز فائدے بھی اٹھائے لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر فریب کھاتے تھے۔ کتنے ایسے لوگوں کو قرض دیا جن کے یہاں واپسی کا خانہ نہیں ہوتا۔فرماتے کہ اگر آپ کی وجہ سے دو چار گھروں میں چولھا نہیں جلے تو پھر زندگی بے کار ہے۔لوگوں کے گھروں میں چولھا جلانے کے لیے خود خلوص کی آگ میں جلتے رہتے تھے۔

بچوں سے بے پناہ انسیت تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اسکول آتا دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔داؤد میموریل اسکول کے بچے بھی ان سے بہت مانوس تھے۔موقع ملتے ہی حاضر ہو جاتے۔ کبھی مٹھائی کی فرمائش کرتے تو کبھی پیسوں کی۔دراز میں ٹافیاں چھپا کر رکھتے تھے۔ان کی فرمائش پوری کر کے رخصت کر دیتے کہ باجی دیکھ لیں گی تو پٹائی ہونے لگے گی اور ہاں! سبق یاد کر کے آؤ گے تو اور ٹافیاں دوں گا۔دوپہر کی چھٹی میں آ کر بچوں سے باتیں کرتے۔

کتوں سے بہت ڈرتے اور بلّیوں پر جان چھڑکتے تھے۔گھر میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بلّی موجود رہتی۔اسے دودھ روٹی کھلاتے،اس کے ساتھ کھیلتے اور منہ کے آگے ہاتھ لے جا کر چٹکیاں بجاتے۔ان کی ایک بلّی نے پہلی بار چوہا پکڑا تو اس خوشی میں گھر والوں کی مرغ پلاؤ سے ضیافت کی۔بلّیاں بھی ان سے حد درجہ بے تکلف رہتیں۔کھانے کو بیٹھتے تو اپنا حق وصول کرنے آن پہنچتیں۔مطالعے کے کمرے میں آتے تو کھیلنے کو آجاتیں۔کبھی میز پر بیٹھ کر ہمکتی رہتیں کبھی اچھل کر گود میں جا بیٹھتیں۔یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی بلّی نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور چند دنوں کے اندر اپنی جان دے کر وفاداری کا ثبوت پیش کر دیا۔کسی زمانے میں شکار سے بھی رغبت تھی مگر چڑیوں کے شکار کو برا سمجھتے تھے۔ فرماتے کہ جہاں چڑیاں نہ چہچہائیں وہ جگہ شہرِ خموشاں سے بدتر ہے۔ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آسکی

کہ ایک بوٹی گوشت کے لیے چڑیوں کی جان کیوں لی جاتی ہے۔جو لوگ پرندوں کو پنجرے میں قید رکھتے ہیں ان سے بہت بیزار رہتے تھے۔

سرسید کے بڑے مدّاح تھے۔ان کا ذکر والہانہ انداز میں کرتے تھے۔ان کی نظر میں ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل ان کی تعلیم ہے۔ان کی تعلیمی پسماندگی سے متفکر رہتے۔ان کے مطابق مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا ہی نتیجہ ہے کہ جیل خانے کی آبادیاں بڑھ رہی ہیں۔تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی تھے۔جب ان کی اہلیہ اور محترمہ بلقیس داؤد نے لڑکیوں کے لیے داؤد میموریل ہائی اسکول قائم کیا تو اسے سرکار سے منظور کرانے میں بہت بھاگ دوڑ کی اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

سیاحت کے شایق تھے۔گرمی اور درگا پوجا کی تعطیل میں کہیں تفریح کے لیے نکل پڑتے۔ ہندستان کے تقریباً سبھی قابلِ دید مقامات کی سیر کر چکے تھے۔جے پور ان کا پسندیدہ شہر تھا۔پاکستان کا سفر بھی کیا تھا۔۱۹۸۶ء میں حج بیت اللہ سے شرف یاب ہوئے۔اس طرح وہاں کے سفر کا ارمان بھی پورا ہوا۔سکّم،بھوٹان اور روس کی سیر کا بہت شوق تھا جو پورا نہ ہوسکا۔سفر پر روانہ ہوتے تو بہت احتیاط برتتے تھے۔گلاس،سوئی،دھاگا،سرمہ وغیرہ ساتھ لینا کبھی نہ بھولتے۔خوشبو کا بھی شوق تھا۔

شرابی ادیبوں اور شاعروں سے بدکتے تھے۔کہتے کہ اس منحوس شراب نے کتنے عظیم دانشوروں کو وقت سے پہلے ہم سے جدا کر دیا۔

مذہبِ اسلام کو مذہبِ انسانیت تصور کرتے۔مذہب کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہیں تھے۔مذہبی کتابوں کا مطالعہ پابندی سے کرتے۔تصوّف کی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی۔مدرسوں اور مساجد کی تعمیر میں دل کھول کر چندہ دیتے۔اس کام میں ان کی شریکِ حیات بھی ساتھ دیتیں۔شام کا بیش تر وقت مدرسہ سراج العلوم میں گزارتے جس کے مہتمم مولانا اقبال احمد مظاہری سے انھیں بڑا لگاو تھا۔جب حج کے لیے تشریف لے جانے لگے تو مولانا صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔احرام باندھنے کا وقت آیا تو گلوگیر ہو کر ان سے فرمائش کی ''میری زندگی جیسی گزری ہے وہ آپ کو معلوم ہے لہٰذا آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے غسل دے کر احرام باندھ دیجیے'' حج سے واپسی کے بعد مدینۂ طیبہ کا ذکر کرتے تو آنکھیں بھیگ جاتیں۔لہجے سے سرشاری ٹپکتی۔جب حج کے دوران کعبۃ اللہ میں ایرانیوں نے مظاہرہ کیا تو اس خبر سے بہت مضطرب

ہوئے۔ چند آنکھوں دیکھے واقعات سنائے اور کہا کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔ دیو بند نے جب اپنا جشنِ صد سالہ منایا تو اس میں شریک ہوئے۔ ملک میں ہونے والے مذہبی اجتماعات میں شرکت کے متمنّی رہتے تھے۔ پہلے روزے گنڈے دار رکھتے تھے لیکن حج کے بعد پورے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ تراویح بھی پابندی سے پڑھا کرتے۔ نماز بھی شروع کر دی تھی لیکن اس کی پابندی نہیں ہو پائی۔

اگر چیزیں بے ترتیب پڑی ہوں تو پاشا صاحب خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ فوراً اسے ٹھیک ٹھاک کرنے لگتے۔ یہی حال صفائی کا تھا۔ کھانے کی میز پر ایک چاول بھی گرا دیکھتے تو اسے اٹھا لیتے۔ میز گندی نظر آئی تو کپڑے سے پونچھنا شروع کر دیتے۔ گرمیوں میں جہاں کئی کئی مرتبہ غسل کرتے وہیں جاڑے میں نہانے سے گھبراتے تھے۔ بعض اوقات دھوپ میں پانی رکھتے کہ گرم ہو جائے تو نہاؤں گا۔ معصوم اتنے تھے کہ کسی مرض میں مبتلا ہونے پر کوئی شخص اوٹ پٹانگ دوائیں بتا دیتا تو اسے کھانا شروع کر دیتے۔ ان کی اہلیہ منع کر دیتیں تو ان سے چھپا کر کھاتے تھے۔

اپنے ملازمین کو گھر کے فرد کی طرح سمجھتے۔ ان کا احوال دریافت کرتے رہتے۔ پوشیدہ طریقے سے ان کی مالی مدد کرتے۔ کہیں باہر سے آتے تو ان کے لیے بھی اکثر تحفے لاتے۔ ملازمہ کی صاحبزادی کو بیٹی کی طرح عزیز رکھا اسے بیٹا کہہ کر پکارتے۔ رشتہ طے کرنے کے لیے مئو جانے والے تھے لیکن اجل نے مہلت نہیں دی اور ان کا یہ ارمان پورا نہ ہو سکا۔

ایک باعزّت اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھنے اور صفِ اول کا ظرافت نگار ہونے کے باوجود انانیت اور خود پسندی کے مرض میں گرفتار نہیں تھے۔ اک طرف بڑے ہوٹلوں میں قیام کرتے تو دوسری جانب کوئی فٹ پاتھ پر چائے کی پیش کش کر دے تو انکار نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے بڑے سب کی عزت کرتے لیکن کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ادبی گروہ بندیوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ ادب کی تازہ ترین صورتِ حال سے باخبر رہتے۔ خود کو ہمیشہ طالبِ علم سمجھتے رہے۔ احباب کی کمزوریوں کی جانب اشارے کرتے تو خوبیوں کا اعتراف کرنے میں بھی بخل سے کبھی کام نہیں لیا۔ اگر کوئی ان کی تحریروں پر اعتراض کرتا تو شکریے کے ساتھ اسے قبول کر لیتے۔

پاشا صاحب بہت نفاست پسند تھے۔ نام کی مناسبت سے قدرت نے انھیں جمالیاتی ذوق بھی بخشا تھا۔ پھولوں اور کیکٹس کے بڑے شوقین تھے۔ سیکڑوں قسمیں جمع کر رکھی تھیں۔ موقع ملتے ہی

ہاتھ میں کھرپی لیے، آستینیں چڑھائے باغبانی میں مصروف ہو جاتے۔ کسی سے گوبر کی کھاد منگواتے تو کسی سے پتھر۔ انھیں خود سے گملوں میں ڈالتے اور پانی دیتے۔ کہیں نئے قسم کا کیکٹس دیکھتے تو ایک شاخ توڑ لاتے۔ گملوں کے علاوہ شیشی، بوتل، سیپ اور گھونگھے میں چھوٹے چھوٹے پودے اور کیکٹس لگاتے تھے۔ اپنے مشاغل کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سر کے بال روکنے کے لیے ورزشیں اور دوائیں کرتے رہنا، مزاحیہ ادب پڑھنا لکھنا، بچوں کا ادب پڑھنا، طرح طرح کے مزیدار کھانے پکانا، صبح تڑکے سے رات گئے تک اور سوتے سے اٹھ کر گھر ٹھیک ٹھاک کرتے رہنا۔ ہر بار گھر میں گھستے یا باہر نکلنے میں لیٹر بکس دیکھنا (رات کو بھی) بلّیاں پالنا، باغبانی کرنا، خاص طور پر کیکٹس لگانا (پھولوں کا زمانہ نہیں اس لیے کانٹوں سے پیار کرنا)، عمر چھپانے کے لیے میک اپ کرتے رہنا، ٹائم ٹیبل بنا کر کامیاب زندگی گزارنے کی ناکام کوشش کرنا، نایاب کتب، رسائل، مخطوطے، ماچس کے ڈھکنے، ٹکٹ اور سکّے جمع کرتے رہنا، ناقد، اہلِ ریڈیو، ایڈیٹر، ناشر اور انعامی کمیٹیوں کے ممبروں سے پکّی دوستیاں کرتے رہنا، ناموزوں شعر کہتے رہنا (اپنی تسلّی کے لیے) لاٹری کے ٹکٹ خریدنا، معزّز اصحاب کے بے حد اصرار پر ادبی و شعری نشستیں و مذاکرے کرنا، شادیاں کرانا، سیّاحی اور راتوں رات لکھ پتی ہو جانے کی ترکیبیں سوچتے رہنا''۔
>
> (ماڈل ۱۹۳۶ء۔ احمد جمال پاشا، غیر مطبوعہ)

داؤد میموریل اسکول کی تعمیر کے سلسلے میں جب سون ندی کا بالو آیا تو اتفاق سے اس میں بہت سے رنگین پتھر تھے دن بھر انھیں چنتے رہے۔ اس کام میں مزدور بھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ایک دن وہ پتھر تھیلے میں بھر کر اپنے ایک جوہری دوست کے یہاں لے گئے کہ شاید اس میں کوئی ہیرا یا بیش قیمت پتھر ہو۔ واپس آئے تو اپنے آپ پر ہنستے رہے۔

منصوبے بنانے میں پاشا صاحب کا جواب نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ منصوبے عملی شکل شاذ و نادر ہی اختیار کرتے تھے۔ وہ ایک ایسا تحقیقی مجلّہ نکالنے کے لیے عرصے سے پر تول رہے تھے جس میں صرف ظریفانہ ادب سے متعلق مضامین ہوں۔ اس کا انھوں نے نہ صرف خاکہ تیار کر لیا تھا بلکہ اس کا پہلا شمارہ ''انجم مانپوری نمبر'' کی حیثیت سے بہت حد تک ترتیب بھی دے چکے تھے۔ بیک وقت ظریفانہ ادب

کے اتنے مختلف موضوعات پر کام شروع کر دیا تھا جس کا جلد پورا ہونا اگر ناممکن نہیں تو نہایت مشکل تھا۔ وہ خود کو محدود کر کے اگر اپنا کام شروع کرتے تو یقیناً زیادہ کامیاب رہتے مگر انھوں نے ظریفانہ ادب سے متعلق نامکمل شکل میں جو تحریری اثاثہ چھوڑا ہے اس کو بنیاد بنا کر اعلا پائے کے تحقیقی کام کیے جا سکتے ہیں۔

ہندستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور سیکولر طاقتوں کی پسپائی سے پاشا صاحب بہت بے چین رہا کرتے تھے۔ فسادات میں پولیس کی یک طرفہ جارحیت اور اربابِ اقتدار کے معاندانہ رویےّ پر ہمیشہ مغموم رہا کرتے تھے۔ ان کی مایوسی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ سیکولر ہندستان انھیں اندھیرے میں ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا اور وہ اس کے مستقبل سے خاصے ناامید تھے۔ کبھی کبھی کہتے کہ اگر میں زندگی کے آخری دور میں نہ ہوتا تو یہاں سے ہجرت کر جاتا۔ ''سیاست دانوں سے جی جان سے چڑتے تھے اور اکثر فرماتے کہ مستقبل کی باشعور نسل انھیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ جمشید پور کے فساد میں جب ذکی انور شہید کر دیے گئے تو بہت بے چین ہوئے۔ آہِ سرد کے ساتھ ان کا ذکر کرتے۔ فسادات کا اثر ان کے دل و دماغ پر کتنا گہرا تھا اس کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں شہر گیا میں ایک ظرافت کانفرنس برپا ہوئی۔ پاشا صاحب کے نام دعوت نامہ آیا۔ پھر شرکت کے لیے تقاضے کے خطوط آنے لگے لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب راقمِ حروف نے اصرار کیا کہ آپ کو اس کانفرنس میں شرکت کرنی چاہیے تو انھوں نے مارچ ۱۹۸۳ء کے ''انڈیا ٹوڈے'' کا شمارہ دکھایا جس کے سرورق پر تین قطاروں میں معصوم بچوں کی نعشوں کی تصاویر چھپی تھیں جو ریاست آسام میں نیلی قتلِ عام کا شکار ہوئے تھے۔ رسالہ دکھاتے ہوئے بولے'' ملک میں خوں ریزی ہو رہی ہے اور میں کانفرنس میں جا کر قہقہے لگاؤں یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکتا'' یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرّا گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

احمد جمال پاشا نے بھرپور زندگی گزاری۔ وہ مسرت اور محبت کے خزانے جھولیاں بھر بھر کر لٹاتے رہے۔ دوسروں کی مدد اپنی بساط سے بڑھ کر کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت کم لوگ ان کو پہچان سکے۔ انھوں نے ظرافت کا ایسا لبادہ اوڑھ رکھا تھا کہ عام لوگ تو درکنار، ان سے قریب رہنے والے بھی ان کی اصل شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ انھیں ایک شوخ، بذلہ سنج اور زندہ دل انسان سمجھا جاتا رہا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ پاشا صاحب اندر سے بہت دکھی انسان تھے۔ قدرت نے انھیں غموں سے نباہ کرنے کا حیرت انگیز ملکہ ودیعت کیا تھا۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کو خود سے اظہارِ ہمدردی کا موقع بہت کم دیا۔ وہ دل کے مریض ہو گئے لیکن کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ ان کی زندگی میں ایسے المناک لمحات

اور واقعات بھی آئے جنھوں نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ پہلی بیوی سے علاحدگی بھی ایسا ہی ایک واقعہ تھا لیکن انھوں نے اس پر سلیقے سے قابو پا لیا اور چہرے سے اپنے دکھوں کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ قاضی عبدالستار نے اس واقعے کی جانب یوں اشارہ کیا ہے:

> ''کچھ سال ہوئے لکھنؤ میں کسی نے بتایا کہ جمال ایک سنگین نجی حادثے سے دوچار ہو گیا۔ مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس سفر میں جمال سے نہ ملنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک شام عابد سہیل کے ساتھ امین آباد سے گزر رہا تھا کہ جمال سے ٹکرا گیا...... میں اس اچانک ملاقات سے پریشان تھا کہ عابد سہیل کے کسی جملے پر جمال نے اپنا جانا بوجھا قہقہہ سر کیا اور میں جو تعزیت اور رسمی ہمدردی کے ابجد سے قطعی ناآشنا ہوں، جیسے زندہ ہو گیا۔ اب جمال چل نکلے تھے اور حسبِ دستور باغ و بہار تھے۔ میں قہقہوں کو بجا بجا کر دیکھ رہا تھا، مسکراہٹوں کو پرکھ رہا تھا لہجے اور الفاظ کے غلافوں کو ہٹا ہٹا کر اپنے مطلب کے معانی کی جستجو کر رہا تھا لیکن وہاں کچھ تھا ہی نہیں سوا اس کے جو چہرے پر چمک رہا تھا اور ہونٹوں سے برس رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص پندرہ سولہ دن پہلے اتنے سنگین حادثے سے دوچار ہوا ہے اور آج پہلی بار دفتر گیا ہے۔ فن کاروں میں یہ توانائی عام نہیں ہوتی۔ کر گزرنے کی طاقت ایک چیز ہے اور ہنس کر جھیل جانے کی استقامت بالکل دوسری شے ہے''۔
>
> (احمد جمال پاشا، قاضی عبدالستّار، ''کتاب نما'' دہلی جنوری ۱۹۸۹ء ص ۵۸۔۵۹)

اولاد سے محرومی کا غم بھی معمولی نہیں ہوتا۔ پاشا صاحب نے اپنی چھوٹی سی جنت میں اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب کون نہیں دیکھتا؟ ایسا گلشن بھلا کس کام کا جس میں کوئی پھول ہی نہیں کھلے۔ ایسے باغ میں بلبلوں کی زمزمہ سنجی کیسے ممکن ہے جس میں بہاروں کا گزر نہ ہو؟ لیکن احمد جمال پاشا نے خزاں میں بہار کے ترانے سنائے۔ ان کا سینہ فگار ضرور ہوا لیکن انھوں نے ''جنت نگاہ'' اور ''فردوس گوش'' کا منظر ہی پیش کیا۔ جب احساسات ٹیسیں مارنے لگیں تو زخموں کے دہن پر انگلیاں رکھ کر دل کی بانسری سے مسرت کا نغمہ چھیڑنا ایسا کربناک عمل ہے جس سے اچھے اچھوں کا کلیجہ پانی ہو کر بہہ جائے لیکن پاشا صاحب نے یہ کام بہت حد تک کر دکھایا۔ البتہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ انسان تھے غالبؔ کی زبان میں پیالہ و ساغر نہیں تھے جو گردشِ مدام سے گھبرا نہ جاتے۔ لہٰذا جس طرح ٹوٹے ہوئے

پیمانے سے مَے چھلک پڑتی ہے اسی طرح کبھی کبھی دلِ شکستہ سے بھی آہ کا دھواں نکل جاتا ہے۔ میرے نام خط میں لکھتے ہیں:

''میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کن ذہنی الجھنوں میں ہوں جس کی وجہ سے زندگی میں ترتیب نہیں ہو پاتی۔ ایک قسم کے فرار کی زندگی گزار رہا ہوں اور یہ ہنستا ہوا آدمی اندر سے کس قدر ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اب تمھیں کیا بتاؤں''۔

احمد جمال پاشا نے اپنی شخصیت کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ اتنے گہرے ہیں کہ جن کا فنا ہونا مشکل ہے۔ عابد سہیل نے درست لکھا ہے کہ:

''احمد جمال پاشا آج ہم میں نہیں لیکن ان کی یاد وہ متاعِ عزیز ہے جسے ہر وہ شخص جوان سے مل چکا ہے، ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھے گا۔ ایسا بے ریا، صاف دل، ہنسوڑ، روتوں کو ہنسانے والا، ان کے دکھ درد بانٹنے والا اور احسان کر کے شرمندہ ہونے والا یارِ شاطر اور یارِ طرحدار اب پیدا ہونے سے رہا''۔

(انتخاب ''مضامینِ احمد جمال پاشا'' مرتبہ: عابد سہیل۔ اترّ پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔۱۹۸۸ص ۱۵)

تصنیفات وتالیفات

احمد جمال پاشا بے حد فعال ادیب تھے۔ انھوں نے تقریباً چار دہائیوں تک ادبی خدمات انجام دیں۔ وہ بنیادی طور پر ظرافت نگار تھے۔ ان کی تنقیدوں اور تالیفات کا مرکز ظرافت ہی تھی۔ ظرافت کے علاوہ بھی انھوں نے عمر کے آخری حصے میں کچھ کام کیے۔ احمد جمال پاشا نے جو کچھ لکھا اس کا نصف سے زیادہ حصہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر نہیں آ سکا۔ ان کے ورثا کی سرد مہری کی وجہ سے اس کی امید بھی کم ہے کہ مستقبل قریب میں وہ چیزیں شائع ہو سکیں گی۔ بہر کیف! پاشا صاحب کی جن مطبوعہ تصنیفات تک میری رسائی ہو سکی اس کا تعارف پیشِ خدمت ہے۔

(الف) ظریفانہ مضامین کے مجموعے:

۱۔ اندیشۂ شہر: یہ احمد جمال پاشا کے ظریفانہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو پنچ پبلشرز امین آباد لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوا۔ صفحات کی تعداد دوسو آٹھ ہے۔ سنہ اشاعت موجود نہیں۔ لیکن احمد جمال پاشا نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کی دوسری اشاعت میری لائبریری لاہور سے ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ کتاب کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) مقدمہ ڈاکٹر وزیر آغا (۲) مقدمے کا مقدمہ (۳) ادب میں مارشل لا (۴) یونیورسٹی کے لڑکے (۵) مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا (۶) رستم امتحان کے میدان میں (۷) غدر سن انیس سو ستاون کے اسباب (۸) کپور، ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (۹) ٹائم ٹیبل (۱۰) آموختہ خوانی میری (۱۱) مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں (۱۲) میری بہن کی سہیلیاں (۱۳) کتے کا خط پطرس کے نام (۱۴) گدھے کا خط کرشن چندر کے نام (۱۵) معمارِ اعظم کا خط، نئی نسل کے نام (۱۶) پڑھے لکھوں کے خطوط محمد فاضل کے نام۔

۲۔ ستم ایجاد: ۱۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ''کتاب پبلشرز'' لکھنؤ کی جانب سے ۱۹۶۶ء میں طبع ہوئی۔ مصنف نے ''ستم بالائے ستم'' کے عنوان سے اس کا مقدمہ لکھا۔ باقی عنوانات اس طرح ہیں:

(۱) ستم ایجاد کرکٹ اور میں بے چارہ (۲) رہنمائے معمہ بے تصویر (۳) شکر کا چکر (۴) آٹھواں سُر (۵) چل مرے خامے بسم اللہ (۶) بردکھوّے گئے (۷) سچ بولے بھر پایا (۸) اچھے کھانے (۹) درخواستیں مطلوب ہیں (۱۰) ڈارون کے ڈارون (۱۱) آنی جانی قیامت (۱۲) نیا پیسہ (۱۳) ٹیلی گرام (۱۴) چھوٹا قد (۱۵) ناپسندیدہ لوگ (۱۶) لالہ شہرت دین ہوکا (۱۷) شامتِ اعمال (۱۸) الکشن لڑایا (۱۹) چودھری صاحب نے روزہ رکھا (۲۰) فرمائشی مقدمہ (۲۱) خالی مکان (۲۲) دفتر میں نوکری (۲۳) ادب میں بانس کی اہمیت (۲۴) جرنلسٹ ہونا (۲۵) میرے ادبی نظریے اور عقیدے (۲۶) کیمپٹی فال کی سیر (۲۷) مسند، گدّی، کرسی اور بوری (۲۸) مونچھیں۔

۳۔لذتِ آزار: یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں پنچ پبلشرز لکھنؤ کی جانب سے طبع ہوئی۔ ابتدا میں مصنف کا ایک صفحے کا مختصر مقدمہ ہے۔ بقیہ مضامین درج ذیل ہیں:

(۱) ہم نے ریسرچ کی (۲) مکان کی تلاش (۳) تختیاں (۴) سگریٹ پینا (۵) ریڈیو سے خریدو (۶) گھر میں رہنا (۷) وقت کاٹنا (۸) میری زندگی کا ایک مزاحیہ پہلو (۹) بھولنے کی عادت (۱۰) آئینہ دیکھا اپنا سا منہ لے کے رہ گئے (۱۱) بن بلائے مہمان (۱۲) موسمی ہائے ہائے (۱۳) بور کی قسمیں (۱۴) ادب میں بینک بیلنس (۱۵) خوشامد میں آمد (۱۶) ماموں کا رشتہ (۱۷) ڈھل مل بھائی (۱۸) مسٹر ضرب تقسیم (۱۹) مسٹر جوڑ توڑ (۲۰) لفاظ صاحب (۲۱) رہنمائے تنقید نویسی جدید (۲۲) گلیمر بوائے کا خط قرۃ العین حیدر کے نام۔

۴۔مضامینِ پاشا: یہ مجموعہ ۱۹۷۴ء میں مکتبۂ دین و ادب لکھنؤ سے شائع ہوا۔ صفحات کی تعداد ۲۱۲ ہے۔ شمشاد علی فاؤنڈیشن سیوان سے ۲۰۰۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ دراصل یہ مجموعہ احمد جمال پاشا کے مضامین کا انتخاب ہے۔ کتاب میں کہیں اس کا تذکرہ تو نہیں لیکن پاشا صاحب نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ یہ انتخاب کرشن چندر نے کیا تھا۔ کتاب کا انتساب بھی کرشن چندر کے نام ہے۔ ''شانِ نزول'' کے عنوان سے دو صفحے کا مقدمہ ہے۔ مضامین کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا (۲) یونیورسٹی کے لڑکے (۳) شکّر کا چکّر (۴) مکان کی تلاش (۵) ادب میں مارشل لا (۶) مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں (۷) کپور: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (۸) رستم امتحان کے میدان میں (۹) ادب میں بانس کی اہمیت (۱۰) ہم نے ریسرچ کی (۱۱) سروری منزل (۱۲) ڈھل مل بھائی (۱۳) گلیمر بوائے کا خط قرۃ العین حیدر کے نام (۱۴) گدھے کا

خط کرشن چندر کے نام (۱۵) پڑھے لکھوں کے خطوط محمد فاضل کے نام (۱۶) لالہ شہرت دین ہوکا۔

۵۔چشمِ حیراں: یہ کتاب نئی آواز جامعہ نگر دہلی سے ۱۹۷۸ء میں چھپی۔ صفحات کی تعداد ۱۲۰ ہے۔ ''چشمِ حیراں'' کے عنوان سے دو صفحات پر مشتمل مصنف کا مقدمہ ہے۔ مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) سڑک کے گڑھوں سے انٹرویو (۲) زہر کے سوداگر (۳) رشوت ٹیکس (۴) زیرو سے ہیرو (۵) وزیرِ قحط (۶) حالات قابو میں ہیں (۷) جوتا کانفرنس (۸) ادھار کا چسکا (۹) ہم نے ریسرچ کی (۱۰) بھوندو میاں (۱۱) بھولنا (۱۲) تھرڈ کلاس گڈ بائی (۱۳) سڑک کا گھیراؤ (۱۴) جس محلّے میں ہے ہمارا گھر (۱۵) پورٹ فولیو (۱۶) جانبداری (۱۷) چند لمحے آل پن کے ساتھ (۱۸) کرسی (۱۹) چیونٹی (۲۰) ڈھل مل بھائی (۲۱) مسٹر گوموٹوموسے انٹرویو (۲۲) اصغر علی بی۔اے (۲۳) مسٹر ہاں ہاں۔

۶۔ پتیوں پر چھڑکاؤ: پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ صفحات ۲۷۶ ہیں۔ ابتدا میں پروفیسر وہاب اشرفی کا مقدمہ ہے اور کتاب کے آخر میں طرزِ پاشا کے عنوان سے ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ پاشا صاحب نے ''جڑوں کی تلاش میں'' کے عنوان سے اپنا مقدمہ لکھا ہے۔ مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) تماشائے ادب (۲) شرافت کی تلاش میں (۳) جنت سے واپسی (۴) کتاب کی جلد (۵) محبوب کی فریاد (۶) گلّی ڈنڈے پر سیمنار (۷) اوکیات (۸) مرزا آمد بیگ (۹) استاد حیرت (۱۰) امتحان میں نقل کا فن (۱۱) لالہ توندومل (۱۲) سب سے بڑی ذات بذات (۱۳) جائیں تو جائیں کہاں (۱۴) گدھے کی شان میں ایک قصیدہ (۱۵) جب میرا پہلا مضمون چھپا (۱۶) ذکر اس پری وش کا (۱۷) چمچہ کانفرنس (۱۸) نوکر کا چکّر (۱۹) غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹیڈ (۲۰) اقبال کی تلاش میں۔

(ب) تنقیدی کتابیں:

۱۔شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت: یہ مختصر کتاب پہلے ''شوکت تھانوی: ایک صحافی'' کے عنوان سے ''نقوش'' لاہور کے شوکت تھانوی نمبر میں ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اسے ''شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت'' کے عنوان سے ۱۹۶۷ء میں پنچ پبلشرز لکھنؤ نے شائع کیا۔ صفحات کی تعداد ۱۰۴ ہے۔

۲۔ظرافت اور تنقید: ۲۵۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ۱۹۸۲ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کے سبھی مضامین ظرافت سے متعلق ہیں۔ مصنف کا یہ دعوا

درست ہے کہ ادب میں یہ پہلا مجموعہ ہے جس میں صرف ظرافت اور ظریفوں کو کھنگالا گیا ہے۔ تنقید نگار کے مختصر مقدمے کے علاوہ مقالات کے عنوانات اس طرح ہیں:

(۱) فنِ لطیفہ گوئی (۲) شہرۂ آفاق ظریف ملاّ نصرالدین (۳) غالبؔ کے ایک ممتاز کارٹونسٹ، وہاب حیدر (۴) منشی سجاد حسین کی ظرافت (۵) صاحبِ صدق کا نثری اسلوب (۶) ظریف اور ''سرپنچ'' (۷) ''الجھپٹ''، اردو کا ایک قلمی ظریف اخبار (۸) شوکت تھانوی بحیثیت کالم نگار (۹) طنزیاتِ مانپوری (۱۰) پطرس بخاری (۱۱) کرشن چندر کی ظرافت (۱۲) مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری (۱۳) ہزل گوئی، لکھنؤ میں (۱۴) شوق بہرائچی (۱۵) حاجی لق لق کی عیدیاں (۱۶) فرمانِ ظرافت کا شاعر (۱۷) شاد عارفی کی بے باکی (۱۸) راجا مہدی علی خاں کی ظرافت (۱۹) مرزا محمد اقبال ماچس لکھنوی (۲۰) عبداللہ ناصر کی یاد میں۔

(ج) مرتبہ کتابیں:

۱۔ **مجاز کے لطیفے:** یہ احمد جمال پاشا کی باضابطہ پہلی کتاب ہے جو نومبر ۱۹۵۷ء میں جھلک بک ڈپو علی گڑھ سے طبع ہوئی۔ صفحات ۸۷ ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۴ پر مجاز کی خود کشیدہ تصویر بھی ہے اور ان کا یہ شعر بھی دستخط کے ساتھ بخطِ شاعر درج ہے ۔

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

۱۴۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مکتبۂ شاہراہ دہلی سے جون ۱۹۶۶ء میں چھپا۔ اس کتاب کا تعارف فراق گورکھپوری نے کرایا اور پیش لفظ سید احتشام حسین نے لکھا۔

۲۔ **غالب سے معذرت کے ساتھ:** یہ مجموعہ ۱۹۶۴ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا۔ صفحات ۲۲۲ ہیں۔ یہ کتاب نسیم انہونوی صاحب کی فرمائش پر تیار کی گئی تھی۔ کتاب کا پیش لفظ احمد جمال پاشا نے غالب کے خطوط کی پیروڈی کے انداز میں لکھا ہے۔ اکیاون قلم کاروں کی نظم ونثر کی تحریریں یکجا کردی گئی ہیں۔ نظم ونثر پر مشتمل یہ تمام تحریریں ظریفانہ ہیں۔

۳۔ **اردو کے چار مزاحیہ شاعر:** جون ۱۹۶۵ء میں مکتبۂ دین وادب لکھنؤ سے یہ کتاب طبع ہوئی۔ صفحات ۲۰۲ ہیں۔ اس میں احمد جمال پاشا نے ظریف لکھنوی، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری اور مجید لاہوری کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے ان کے فن کی خوبیاں واضح کی ہیں اور ان کے کلام کا جامع انتخاب

پیش کیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان سے بھی طبع ہوئی۔

۴۔ **اردو کے پانچ مزاحیہ شاعر:** یہ کتاب ''اردو کے چار مزاحیہ شاعر'' کا ترقی یافتہ ایڈیشن ہے جس میں پانچویں شاعر کے طور پر رضا نقوی واہی کو شامل کیا ہے۔ ۲۵۶ صفحات کی یہ کتاب شفاعت بک ڈپو لکھنؤ سے فروری ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پر آئی۔

۵۔ **ملاّ نصرالدین کے لطیفے:** اگست ۱۹۶۶ء میں ۱۹۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکتبۂ دین وادب لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ کتاب کے آغاز میں احمد جمال پاشا کا مقدمہ ہے اور پھر ملاّ نصرالدین کے لطیفے یکجا کردیے گئے ہیں۔

۶۔ **فنِ لطیفہ گوئی:** یہ کتاب پنچ پبلشرز لکھنؤ سے ۱۹۶۷ء میں چھپی۔ صفحات ۱۴۴ ہیں۔ لطیفہ گوئی کے فن پر آٹھ صفحات پر مشتمل احمد جمال پاشا نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس کے بعد ہر صفحے پر ایک لطیفہ درج کیا گیا ہے۔

۷۔ **ہجویاتِ میر:** پنچ پبلشرز لکھنؤ سے ۱۵۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ ابتدا میں مرتب کا آٹھ صفحے کا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد محمد تقی میر کی ۲۲ ہجویں جمع کردی گئی ہیں۔

۸۔ **نذرِ حمید:** یہ کتاب سیوان کے کہنہ مشق شاعر حمید تمنائی کی شخصیت اور فن پر مشتمل ہے۔ جسے کبیر وچار منچ سیوان نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ صفحات کی تعداد ۱۷۶ ہے۔ اسے احمد جمال پاشا اور پربھو نارائن ودریاتھی نے مل کر ترتیب دیا ہے۔ کتاب کا غالب حصہ اردو میں ہے اور بقیہ حصہ ہندی اور انگریزی تحریروں پر مشتمل ہے جسے مختلف اصحاب نے لکھا ہے۔

۹۔ **ہماری نظمیں:** یہ درسی کتاب ہے جس کے مرتبین احمد جمال پاشا اور ڈاکٹر زبیر احمد قمر ہیں۔ اسے بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمٹیڈ نے ۱۹۷۹ء میں درجہ نو اور دس کے طلبہ کے لیے شائع کیا۔ صفحات ۹۰ ہیں۔

۱۰۔ **جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے:** ''پیامِ انسانیت'' کے موضوع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ''کوٹھی نشاط افزا'' سیوان کے سبزہ زار میں ۱۴/اپریل ۱۹۷۸ء کو ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر کو احمد جمال پاشا نے ٹیپ کی مدد سے مرتب کیا۔ ۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ جے۔ کے پرنٹرس دہلی سے طبع ہوا۔ میرے پیشِ نظر کتاب کا جو نسخہ ہے اس کا سرورق موجود نہیں لہٰذا اس کے ناشر کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

(د) بچوں کے لیے کتابیں:

۱۔ بہادر ٹمبا: ۱۶۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے مارچ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے اصل مصنف کیتھلن آرناٹ ہیں۔ احمد جمال پاشا اس کے مترجم ہیں۔ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب کا نام کہیں بھی درج نہیں ہے۔ اس میں کوئی مقدمہ بھی نہیں ہے۔

۲۔ دنیا کی لوک کہانیاں: یہ کتاب بہار اردو اکادمی پٹنہ سے ۱۹۸۳ء میں چھپی۔ صفحات کی تعداد ۲۰۰ ہے۔ اس میں مختلف ممالک کی ۵۲ لوک کہانیاں اکٹھا کر دی گئی ہیں۔

۳۔ بالشتیے کی گھنٹی: ہندی میں یہ کتاب جیبی سائز میں گیان بھارتی بال پاکٹ بکس سے چھپی۔

۴۔ طلسمی کتا: یہ کتابچہ نسیم بک ڈپو سے ۱۹۷۲ء میں طبع ہوا۔ قیمت ۲۵ پیسے ہے۔

۵۔ آسمانی یاقوت: یہ کتابچہ بھی نسیم بک ڈپو سے جون ۱۹۷۲ء میں طبع ہوا۔ قیمت ۶۰ پیسے ہے۔ یہ کتاب ترجمہ ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ احمد جمال پاشا کی کتابوں کے کچھ اشتہارات بھی شائع ہوئے ہیں مثلاً ''دنیا کے بہترین لطیفے''، ''اودھ پنچ کے لطیفے''، ''مزاح نگاروں کے لطیفے''، ''شوکت تھانوی کے لطیفے''، ''مضامینِ اکبر''، ''چند حسینوں کے خطوط''، ''کلامِ سید محمد جعفری'' وغیرہ۔ ان میں سے کوئی کتاب بھی طبع نہیں ہوئی۔ احمد جمال پاشا کی زندگی میں ''بیرن منک ہاؤزن کے حیرت انگیز کارنامے (ترجمہ)''، ''روسی لوک کہانیاں''، ''انشائے جمال'' اور ''چراگاہ'' تیار ہو چکی تھیں لیکن پاشا صاحب کی ناگہانی وفات کی وجہ سے یہ نہیں چھپ سکیں۔ ان کی وفات کے بعد راقم الحروف کی نگرانی میں ان کے خاکوں کا مجموعہ ''نقوش'' کے نام سے اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ظرافت شناسی'' کے نام سے ترتیب دیے جا چکے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کی اشاعت بھی عمل میں نہیں آسکی۔ ان کتابوں کے علاوہ چھوٹی بڑی ۲۴ کتابوں کے مسودات پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں موجود ہیں۔ ان مسودات کا کیا ہوگا اس کے بارے میں کچھ کہنا فی الوقت ممکن نہیں۔

❋

مضمون نگاری

احمد جمال پاشا کی ظرافت کی ابتدا ۱۹۵۰ء سے ہوتی ہے۔ انھوں نے تقریباً دس برس کے عرصے میں ایک ظرافت نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان قائم کر لی۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''اندیشۂ شہر'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا جس نے اہلِ علم حضرات کی توجہ فوراً اپنی جانب مبذول کرالی۔ یکے بعد دیگرے متعدد مجموعوں کی اشاعت کے بعد وہ اردو ظرافت کی اولین صف میں جگہ پانے کے مستحق قرار پائے۔

احمد جمال پاشا کے فن پر جن لوگوں نے قلم اٹھایا ان کی اکثریت انھیں طنز نگار نہیں بلکہ مزاح نگار تسلیم کرتی ہے اور ان کی طنز نگاری کو محض ضمنی طور پر مانتی ہے۔ دوسری طرف ایسے اہلِ قلم بھی موجود ہیں جو انھیں صرف طنز نگار کے دائرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں اقسام کے نقادوں نے احمد جمال پاشا کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مزاح نگار اور طنز نگار دونوں حیثیتوں سے اہم مقام کے حامل ہیں لیکن ان کی مضمون نگاری کے مجموعی تناظر میں ان کی طنز نگاری کا پلّہ گراں نظر آتا ہے۔ ''ادب میں مارشل لا''، ''مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا''، ''آٹھواں سُر''، ''انجمنِ تحسینِ باہمی''، ''ڈارون کے ڈارون''، ''ادیبوں کی قسمیں''، ''دفتر میں نوکری''، ''مسند، کرسی، گدّی اور بوری''، ''ادب میں بانس کی اہمیت''، ''میرے ادبی نظریے اور عقیدے''، ''ہم نے ریسرچ کی''، ''ادب میں بینک بیلنس''، ''رہنمائے تنقید نویسی جدید''، ''سڑک کے گڑھوں سے انٹرویو''، ''وزیر قحط''، ''تماشائے ادب''، ''شرافت کی تلاش میں''، ''جنّت سے واپسی''، ''کتاب کی جلد''، ''گلّی ڈنڈے پر سیمینار''، ''لالہ توندومل''، ''غالب اینڈ کمپنی پرائیوٹ لمٹیڈ'' اور ''اقبال کی تلاش میں'' احمد جمال پاشا کے عمدہ طنزیہ مضامین ہیں۔

احمد جمال پاشا کے مزاحیہ مضامین میں ''مقدمے کا مقدمہ''، ''ستم ایجاد کرکٹ اور میں بے چارہ''، ''رہنمائے معمہ بے تصویر''، ''شکر کا چکر''، ''اچھے کھانے''، ''لالہ شہرت دین ہوکا''، ''چودھری صاحب نے روزہ رکھا''، ''خالی مکان''، ''بھولنے کی عادت''، ''بن بلائے مہمان''، ''موسمی ہائے ہائے''، ''بور کی قسمیں''، ''ادھار کا چسکا''، ''ہمیں شکوہ نہیں'' اور ''کتاب کی جلد'' فن کا اعلا معیار پیش کرتے ہیں۔

''ادب میں مارشل لا'' احمد جمال پاشا کا شاہکار ہے۔ یہ مضمون انھوں نے اس وقت لکھا تھا جب پاکستان میں ایوب خاں نے مارشل لا لگایا تھا۔ مارشل لا یا ایمرجنسی کا نفاذ عموماً اسی وقت ہوتا ہے جب ملک طوائف الملوکی کا شکار ہوجائے اور امن وامان کی کوئی دوسری صورت باقی نہ رہے۔ چنانچہ احمد جمال پاشا نے مارشل لا کا اطلاق ادب میں کیا اور یہ دکھایا کہ ادب میں کیسی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ شاعر، ادیب، ناقد، محقق، مدیر اور ناشر سب کے سب موقع پرستی، مصلحت اندیشی، جانب داری اور گروہ بندی کا شکار ہیں۔ کسی کو اپنے منصب کا پاس ولحاظ نہیں۔ سبھی اپنی ذمّے داریاں فراموش کر چکے ہیں۔ نقاد بغیر پڑھے تنقیدیں لکھ رہے ہیں۔ مبصر کتابوں پر دھواں دھار تبصرے کر رہے ہیں حالانکہ ان کتابوں کے اوراق تک نہیں کٹتے۔ شعرا اپنے گھر بار سے غافل ہوکر دوسروں کی زمین میں غزلیں کہہ رہے ہیں۔ ادبا بدترین کتابوں پر انعامات حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں اور تعلقات کے بل پر اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں اور صحافی پیسہ کمانے کی غرض سے سنسنی خیز خبریں چھاپ رہے ہیں وغیرہ۔ پاشا صاحب نے ان تمام پہلوؤں پر سختی سے گرفت کی ہے لیکن اس کے باوجود فن کا دامن ان کے ہاتھوں سے کہیں بھی چھوٹتا نظر نہیں آتا۔ یہ مثالیں دیکھیے:

> ''ادب کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں تھے جو تاج محل بنانا جانتے ہوں بلکہ تاج محل کھودنے کے فن سے واقف ہوں۔ عموماً جس کے بارے میں کسی کونے سے کوئی فتویٰ صادر کر دیا جاتا بقیہ سب اسی کو اپنے الفاظ میں دہرا دیتے۔ ادبی سرقے سرقۂ بالجبر کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ادب، صحافت اور حماقت کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل تھا۔ نئے نام لیتے ہوئے سب بے حد ڈرتے اور گھبراتے تھے۔ اچھا ادب وہ سمجھا جانے لگا تھا جو زیادہ بکے''۔ (اندیشۂ شہر ص ۲۳)

> ''گرفتار ہونے والوں میں سب سے دل چسپ ایک بزرگ ہیں جو 'تحقیق لفظ ل' کے اوپر ہزار صفحات جہازی کا ایک مختصر رسالہ تصنیف کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ سارا طومار اس بات پر تھا کہ ل عربی ہے یا ترکی؟ ان پر الزام ہے کہ جب تک وہ اختلاف کا پہلو پیدا نہ کرلیں قلم نہیں اٹھاتے...... فوجی وکیل کا کہنا ہے کہ جو بات یہ لکھ رہے تھے اور نہ جانے کب تک لکھتے رہتے، یہ بات تو صرف دو لفظوں

> میں بھی بیان کی جاسکتی تھی کہ آیا ہے یا نہیں ہے''۔ (اندیشۂ شہر ص ۲۸)

''ادب میں مارشل لا'' کے سب سے دل چسپ حصّے وہ ہیں جہاں ادبی مجرموں کو سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک مبصر کو ان کے گھر میں قید کر دیا گیا اور یہ سزا دی گئی کہ وہ ان کتابوں کے اوراق کاٹیں جن پر ان کے تبصرے شائع ہوکر دھوم مچا چکے ہیں۔ ایک ادیب کو جو معمولی باتوں کو غیر معمولی طوالت کے ساتھ بیان کرتے تھے، جیل میں بند کر دیا گیا اور ان سے مختصر نویسی کی مشقت لی جانے لگی۔ اس طرح کے شوخ رنگوں سے یہ پورا مضمون معمور ہے۔ احمد جمال پاشا نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی زمانے میں یہ مضمون لکھا تھا لیکن اپنی شوخ بیانی اور دیدہ وری کی بنا پر یہ آج بھی اسی طرح دل چسپ اور تر وتازہ نظر آتا ہے۔ پاشا کی ظرافت کو اگر ایک قلعہ سے تعبیر کریں تو یہ مضمون اس قلعے کے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔

احمد جمال پاشا کے وہ مضامین جن کا تعلق ادب سے ہے، زیادہ کامیاب ہیں۔ یہاں ان کا قلم بڑی بے باکی اور درّاکی سے چلتا ہے۔ وہ ادیبوں کی بے ادبیوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ ادب کے ناخداؤں نے جس طرح ادب کو سیاست کی آماجگاہ بنا کر رکھ دیا ہے، ادب کے نام پر آئے دن جو تقریبیں منعقد کی جاتی ہیں ان میں ادب سے زیادہ سیاست ہوتی ہے۔ احمد جمال پاشا ان بے ادبیوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ان کی عکاسی اس انداز سے کرتے ہیں کہ ہمیں قلبی بشاشت کے ساتھ ساتھ فکری بصیرت کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مضمون ''گلی ڈنڈے پر سیمینار'' کو لیجیے۔ اس کے عنوان میں ہی یہ طنز پوشیدہ ہے کہ عصرِ حاضر میں اردو ادب میں کیسے کیسے لایعنی موضوعات پر سیمینار منعقد ہوتے ہیں۔ اس طرح کے سیمیناروں میں مقالہ نگاروں میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو ذہنی طور پر بالکل مفلس ہوتے ہیں یا متعلقہ موضوع کے بارے میں ان کی معلومات صفر ہوتی ہیں لیکن مقالوں پر ہونے والی بحث میں شامل ہوکر موضوع کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور غیر متعلقہ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر اس کی تائید اور تردید میں ہی سارا وقت ہنگاموں کی نذر ہوجاتا ہے اور اس طرح سیمینار و سمپوزیم کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ یہ سطور ملاحظہ فرمائیں:

> ''دستور کے مطابق ہر سیمینار کسی نہ کسی موضوع پر ہوتا ہے اور بحث کرنے والے ہمیشہ موضوع سے بہک جاتے ہیں۔ وہ بحث ہی کیا جو موضوع پر ہو اور وہ موضوع کیا جس پر بحث ہو سکے۔ چنانچہ اس تاریخی سیمینار میں بھی بہکنے والے اس پر

اتر آئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بحث نہیں کر رہے ہیں گلّی ڈنڈا کھیل رہے ہیں''۔

(پتیوں پر چھڑکاؤ ص ۷۴۔۷۵)

''کچھ مقرّرین نے حسبِ معمول رٹے رٹائے اشعار اور دوسروں سے لکھوائی ہوئی تقریروں کی مدد سے ثابت کیا کہ غالبؔ اور اقبالؔ کے یہاں جو درسِ حیات ہے اس میں بہت ہی واضح اشارے اس کھیل کے ملتے ہیں جن پر افسوس ہے کہ ملک و قوم نے اب تک توجہ نہیں کی ہے۔ گلّی ڈنڈا کھیلنے والے کو اقبال کے 'بچّۂ شاہین' سے تشبیہ دی گئی اور ایسی تالیاں بجیں کہ ہال گونج اٹھا''۔

(پتیوں پر چھڑکاؤ ص ۷۸)

اس مضمون میں سیمنار میں تشریف لانے والوں جغادریوں اور ان کی رزم آرائیوں کی داستان بھی مضمون نگار نے سنائی ہے۔ ''قاضی عبدالودود ایک دہشت پسند محقق'' اور ''اردو تنقید میں کلیم الدین احمد کا قتلِ عام'' جیسے سیمناروں کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کے اندر بہت سے اشارے اور کہانیاں پوشیدہ ہیں۔ ''مچھلیوں کی جنسی سرگرمیوں کے اثرات غذائے انسانی پر'' اور ''بکری کی مینگنی اور غیر ملکی مبادلۂ زر'' پر مقررین کی دھواں دھار تقریریں بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔ ''استاد شاگرد تعلقات مہابھارت میں'' کا اشارہ بھی بڑا معنیٰ خیز ہے۔ گلّی ڈنڈا کے بارے میں عام مقررین کے علاوہ فلسفۂ جدید کے عالم، مولانائے محترم، ماہرِ معاشیات اور ایک سائنس داں کی زبانی پاشا صاحب نے جو باتیں کہی ہیں وہ ان کی ذہنی پرواز کا واضح ثبوت ہیں۔ سیمنار میں بننے والی کمیٹی اور اس کے آپسی اختلافات، ایک دوسرے کے خلاف نعرے بازی، میزیں تھپ تھپا کر گھونسے دکھانا اور آخر میں مار پیٹ جس کے نتیجے میں ڈائس پر لیڈروں کے بجائے جوتے چلنا شروع ہو گئے، ان سب بیانات اور اس میں طنز و مزاح کی آمیزش نے اس مضمون کو بہت بلند پایہ بنا دیا ہے۔

احمد جمال پاشا صرف ادبی تقریبوں اور سیمناروں کو ہدفِ طنز بنا کر خاموش نہیں ہوتے بلکہ اس راستے پر وہ ہمیں دور تک لے جاتے ہیں۔ ملک بھر میں پھیلی ہوئی اردو اکادمیوں اور اردو کی فلاحی تنظیموں کی جانب سے کتابوں پر انعامات کی تقسیم اور اس کے طریقۂ کار پر ان کا طنز بڑا کاری ہے۔ ادبی معاشرے میں شعرا، ادبا اور نقادوں کی گروہ بندی اور من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کی صورتِ حال پر وہ ایک ایماندار نقاد کی طرح تمام سازشوں کا پردا چاک کرتے ہیں اور ہمیں حیران و پریشان کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

احمد جمال پاشا نے ہندستانی تعلیم گاہوں کی زبوں حالی، اساتذہ کی ناقدری، طلبہ کا شور و ہنگامہ، ان کی ہڑتال، صنفِ نازک سے چھیڑ چھاڑ، نت نئے اسکینڈل، امتحانوں میں نقل کے لیے زور زبردستی وغیرہ کے مسائل پر بھی خوب خوب لکھا ہے۔ اعلا درس گاہوں میں ریسرچ کے پست ہوتے ہوئے معیار پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ''یونیورسٹی کے لڑکے''، ''بھوندو میاں''، ''امتحان میں نقل کرنے کا فن'' اور ''ہم نے ریسرچ کی'' جیسے مضامین میں انھوں نے دل کھول کر اس صورتِ حال کا مذاق اڑایا ہے۔

ادبی کمزوریوں کے ساتھ احمد جمال پاشا اپنے معاشرے پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ سماج میں پھیلی ہوئی ذہنی بیماریوں کو دیکھ کر ان کا دل بے چین ہو اٹھتا ہے۔ وہ خود بھی غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی اس میں شریک کر لیتے ہیں۔ انھیں سماجی زندگی میں جہاں بھی کوئی کوبڑ نظر آتا ہے اس پر انگشت نمائی کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے مضامین ''دفتر میں نوکری'' اور ''جنت سے واپسی'' کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے دفتر کے افسران اور کلرکوں کی ذہنیت پر کیسی کیسی چٹکیاں لی ہیں اور ان کی کمزوریوں کو ظرافت کے پردے میں اجاگر کیا ہے۔ خصوصاً ''جنت سے واپسی'' آغاز سے اختتام تک طنز کا اعلا معیار پیش کرتا ہے۔ اس میں احمد جمال پاشا نے پراویڈنٹ فنڈ کلرک پر تاک تاک اور سونت سونت کر نشانے لگائے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے خواب میں عالمِ محشر کا سماں پیش کیا ہے جہاں فرشتوں کو کلرک کے عہدے پر فائز دکھایا گیا ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کلرک کو عوام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ آج کے کلرک جنھیں کچھ لوگ مظلوم سمجھتے ہیں، عوام کو معمولی کام کے لیے کس قدر ہراساں اور پریشان کرتے ہیں، پاشا صاحب نے اس کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے لیکن طنز کی اوٹ سے مقصد کہیں بھی جھانکتا نظر نہیں آتا اور ہمیں صاحبِ مضمون کے فن کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔

اردو ظرافت نگاروں میں شاید ہی کوئی ایسا فن کار ہو جس نے سیاست کو اپنے طنز کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ احمد جمال پاشا نے بھی سیاسی زندگی کی آلائشوں پر نسبتاً سختی سے گرفت کی ہے۔ آئے دن پارٹی بدلتے رہنا سیاست کی ایک بڑی لعنت ہے جس نے عوام و خواص کو سخت الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ دل بدل قانون بننے کے باوجود بھی صورتِ حال یہ ہے کہ رات کو جو سیاست داں ''چھومنتر پارٹی'' میں تھا وہ صبح میں کسی اور کا جھنڈا اٹھائے ہوئے نظر آتا ہے۔ گرمیوں میں جو ''تارا چھاپ پارٹی'' میں ہوتا ہے وہ برسات کے پہلے چھینٹے کے ساتھ ''شیر چھاپ پارٹی'' کی گود میں جا بیٹھتا ہے اور سردی آتے آتے خود اپنی پارٹی بنا لیتا ہے۔ احمد جمال پاشا اس صورتِ حال سے نالاں ہو کر ایسے سیاست دانوں کی یوں خبر لیتے ہیں:

"آپ پارٹی کیسے بدلتے ہیں؟ انھوں نے کہا
جیسے دھوتی بدلتا ہوں، کرتا بدلتا ہوں اور جوتا بدلتا ہوں بالکل اسی طرح پارٹی بدلتا
ہوں، عرض کیا!
مگر دنیا کیا کہے گی؟ بولے
وہ زمانے لد گئے جب پارٹی بدلنے پر لوگ کہا سنا کرتے تھے۔ اب تو پارٹی نہ
بدلنے پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔" (پتیوں پر چھڑکاؤ ص ۱۱۱)

ایسے سیاست داں جو دبے کچلے، افلاس و غربت کے مارے اور بھوکے ننگے عوام کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ خود عالیشان بنگلوں میں رہ کر رعایا سے بالکل غافل ہوتے ہیں احمد جمال پاشا ایسے وزیروں کی جب مکروہ صورت دکھاتے ہیں تو طنز کے ساتھ ساتھ ان کا لب و لہجہ قدرے تلخ ہو جاتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرتے وقت مصنف کی پلکیں بھیگ چکی ہیں۔ اس صورتِ حال کی عکاسی کے لیے ان کے مضمون "وزیرِ قحط" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات پر بھی احمد جمال پاشا نے مختلف مضامین میں بڑے تیکھے حملے کیے ہیں۔ ذہنی غلامی اور فرقہ پرستی کے نتیجے میں ہمارے قومی اتحاد و کردار کی جڑیں کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں۔ پاشا صاحب کا یہ فکر انگیز اور پُر درد اقتباس دیکھیے:

"نوّے سال تک ہم نے اپنی قومی جڑوں کی سینچائی کی تو ترش تراشا کر ایک آزاد قوم کی شکل میں دنیا کے نقشے پر طلوع ہوئے۔ مگر آزادی کے سورج کی روشنی صرف میز بانوں کے باورچی خانے پر پڑی۔ جمہوریت کا مطلع ابر آلود ہی رہا۔ من کی دنیا تن کی دنیا میں بدلی تو ہم نے بجائے دماغ کے معدے سے سوچنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ قومی ضعفِ معدہ میں مبتلا ہو گئے۔ ہمارا قومی کردار اگر کوئی تھا بھی تو ان گنت مرادآبادوں اور جمشید پوروں نے چیچک زدہ کر دیا"۔

(پتیوں پر چھڑکاؤ ص ۱۵)

احمد جمال پاشا اپنے مضامین میں ہر جگہ یکساں اندازِ بیان اختیار نہیں کرتے بلکہ موضوع کی مناسبت سے اپنی تحریروں کو نئے نئے رنگ عطا کرتے ہیں۔ موضوع گمبھیر ہو تو اندازِ بیان پُر تاثیر اور طنز کا وار بھی گہرا، دوسری صورت میں انداز شگفتہ ہوتا ہے اور طنز کی لے دھیمی۔ عام طور سے وہ سیدھا سادا انداز ہی اختیار کرتے ہیں لیکن اس سادگی میں بھی طنز کی آمیزش بڑی چابک دستی سے کرتے جاتے ہیں۔ بعض

اوقات ان کے طنز میں بھی مزاح کا لطف آتا ہے ساتھ ہی طنز کی کسک بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ایک طرف ہونٹوں پر تبسّم نمودار ہوتا ہے تو دوسری جانب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی دل میں چٹکیاں لے رہا ہو۔ کبھی کبھی ان کے طنز کو ہم محض مزاح سمجھ لیتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور ہم کھسیانی ہنسی ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کا مضمون "سڑک کے گڑھوں سے انٹرویو" پڑھیے تو اس بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

احمد جمال پاشا کی طنز نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی پُر لطف باتوں میں قاری کو اسیر کر کے اچانک ایک چبھتا ہوا فقرہ ہوا میں اچھال دیتے ہیں یعنی وہ جا بجا طنز کے چھینٹے اڑاتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ طنز غیر متوقع ہوتا ہے جو عموماً براہِ راست موضوع سے تعلق نہیں رکھتا پھر بھی وہ ہمارے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا بلکہ ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس طرح مضمون نگار باتوں ہی باتوں میں کامیابی کے ساتھ اپنا مدّعا بیان کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس عمل میں احمد جمال پاشا مشتاق احمد یوسفی سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ یوسفی کے یہاں یہی چیز زیادہ چمک دمک اور آب و رنگ کے ساتھ نظر آتی ہے۔

احمد جمال پاشا نے اپنی تحریروں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے لطیفوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا مزاح نگار ہوگا جس نے اس کا اہتمام نہ کیا ہو لیکن پاشا صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ لطیفوں کو خواجہ عبدالغفور کی طرح پیوند نہیں بناتے بلکہ شفیق الرحمٰن کی طرح اپنے مضمون کا ایک جزو بنا دیتے ہیں۔ عام طور پر وہ الفاظ سے نہیں کھیلتے اور نہ رعایت لفظی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کا مزاح ان کے دل چسپ اندازِ بیان کا مرہونِ منت ہے۔ ان کی تحریر میں اتنا دم ہے، ان میں اتنی شگفتگی اور اتنی ندرت ہے کہ کسی بھی واقعے کو بیان کریں یا کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال فرمائیں مزاح کے سوتے خود بخود پھوٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ خوبی ہے جو اردو کے خال خال مزاح نگاروں کے یہاں ہی نظر آتی ہے۔

احمد جمال پاشا اپنی شگفتہ تحریروں میں مبالغے کی تکنک سے کام لے کر اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیتے ہیں اور اپنے مقصد پر مسکراہٹوں کی دبیز چادر اڑھا دیتے ہیں۔ اگر اس شگفتہ بیانی کے طلسم میں اسیر ہونے کے بجائے اس سے آزاد ہو کر مسکراہٹوں کی نقاب الٹ دی جائے تو مصنف کی فکر اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ دکھائی دینے لگتی ہے۔ جیسے "شکّر کا چکّر" میں مصنف جب راشن کارڈ اور پیسے لے کر روانہ ہوتا ہے، اس وقت کا سماں دیدنی ہے۔ والدہ امام ضامن باندھ رہی ہیں، بھابی دن اور رات کا

کھانا ساتھ لے جانے کے لیے کہہ رہی ہیں، دادی جان بہو سے بیٹے کا دودھ بخشوا رہی ہیں، بھائی صاحب ساتھ میں بستر اور کچھ فاضل پیسے لے جانے کی ہدایت دے رہے ہیں، بڑی بہن کا مشورہ ہے کہ احتیاطاً فرسٹ ایڈ کا بکس بھی ساتھ رہنا چاہیے، بہنوئی کی خواہش ہے کہ سالے میاں جب شکّر لینے جا رہے ہیں تو سب کا کہا سنا معاف کرتے جائیں اور بیوی بے چاری آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ پوچھتی ہے کہ 'مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں'۔ قمر رئیس نے لکھا ہے کہ:

''یہاں ہیرو ہاتھ میں کپڑا لے کر راشن کی شکر لینے اس طرح رخصت ہو رہا ہے جیسے حضرت عباس مشکیزہ لیے فرات سے پانی لینے جا رہے ہوں۔ مبالغے نے مزاح پیدا کیا ہے لیکن طنز کا ہدف کچھ اور ہے''۔

(تنقیدی تناظر۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۸ء ص ۳۲۔۳۳)

احمد جمال پاشا کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بات کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں اور سوجھ کے ساتھ بوجھ سے بھی کام لیتے ہیں۔ سستے اور عامیانہ مزاح سے انھوں نے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھا۔ وہ مزاح اور ادبی مزاح کا فرق سمجھتے ہیں۔ ایسے مقام پر بھی جہاں قلم کی ہلکی سی لغزش ابتذال کی شکل اختیار کر سکتی تھی، انھوں نے اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ایسے نازک مقام سے بخیر و خوبی گزر جانا فن کارانہ مہارت کے بغیر ناممکن ہے۔

ان کا مزاح تبسّم زیر لب کا ہے اور یہی مزاح کی اعلا قسم ہے۔ کھل کھلا کر ہنسنے کی نوبت ان کے یہاں ذرا کم ہی آتی ہے۔ بھانڈ اور مسخروں والا قہقہہ ان کے یہاں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے پھڑکتے ہوئے جملے جو ظرافت کی جان ہیں مزا دے جاتے ہیں۔ ان جملوں کو پڑھیے اور لطف اٹھائیے:

''کھلاڑی تو اس کو کہتے ہیں جو چوٹ کھا کر مسکرائے اور جیتنے والے سے ہاتھ ملائے''۔ (ستم ایجاد ص ۱۲)

''مقامی ادیبوں نے آنے والے ادیبوں سے درخواست کی، لکھتے وقت ان کا خیال رکھیے گا یہ ابھرتے ہوئے ہیں۔ ڈوبنے والے کو کسی کے ابھرنے پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے''۔ (ستم ایجاد ص ۱۴۲)

''میری کوئی کتاب اردو میں نہ چلے تو اس کا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کرا کے عظیم ادب کے نام پر پیش کرتا اور انتقاماً بین الاقوامی شہرت حاصل کر لیتا ہوں''۔

(ستم ایجاد ص ۲۱۸)

احمد جمال پاشا کی ایک حیثیت ایسی بھی ہے جو اردو کے کسی بھی مزاحیہ ادیب کو حاصل نہیں۔ اس منفرد حیثیت کا سبب ان کے مزاحیہ نثری سہرے ہیں۔ اردو میں منظوم سہروں کی روایت تو بہت قدیم ہے لیکن نثر میں سہرا لکھنے کا سہرا صرف احمد جمال پاشا کے سر بندھتا ہے۔ تا حال اس میدان میں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ یہ نثری سہرے اردو ادب میں خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے مزاحیہ ادب کو ایک نئی جہت عطا ہوئی ہے۔ احمد جمال پاشا نے ان سہروں میں اپنے قلم کی جولانی کو صرف شوخیِ بیان تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لطیف چٹکیاں بھی لی ہیں۔ مثلاً ''سہروں کا سہرا'' میں ایسے شعرا کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جو زندگی میں ایک سہرا کہہ لیتے یا کہلوا لیتے ہیں اور اس کے بعد اس میں معمولی رد و بدل کے ساتھ ہر دوست احباب کی شادی میں پابندی کے ساتھ جھوم جھوم کر پڑھا کرتے ہیں۔ چٹکیوں کا یہ انداز ''باندھ کر کچہری سے آیا ہے دولھا سہرا''، ''حوالاتی سہرا'' اور ''پندرھویں صدی کا خالص شرعی سہرا'' میں بھی موجود ہے۔ شادیوں میں جہیز کی لعنت اور نوجوانوں کے ذہن پر اس کے اثرات کا بڑا خوبصورت بیان ''باندھ کر لائبریری سے آیا ہے محقق سہرا'' اور ''ادبی سہرا'' میں موجود ہے۔ یہ پُر لطف اور مزاحیہ سہرے ہمیشہ دل چسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے۔ مستقبل میں جب سہروں کی تاریخ قلم بند کی جائے گی تو نثری سہروں میں احمد جمال پاشا کا نام سر فہرست ہوگا۔

احمد جمال پاشا لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی تہذیبی فضا میں وہ پروان چڑھے لہٰذا ان کے مضامین میں لکھنوی زبان کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ انھیں سنبھل کر اور ٹھہر ٹھہر کر نہیں پڑھیں گے تو لکھنوی روز مرے کے حسن کو صحیح ڈھنگ سے نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پُر تکلف اور آرائشی زبان نہیں لکھتے لیکن ان کی سادہ بیانی میں ایک طرح کی سحر البیانی پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں لطیف طنز کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے مضامین کو تاریخی ترتیب سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ابتدا میں ان کے طنز میں شگفتگی کا عنصر زیادہ تھا مگر جیسے جیسے ان کے شعور میں پختگی آئی اور وہ اہلِ دنیا کی نیرنگیوں سے واقف ہوئے ان کے یہاں شگفتگی کا عنصر قدرے کم اور طنز میں نشتریت کا اضافہ ہوا۔ انھوں نے اپنی ظرافت کا مواد سیاست، معاشرت، تہذیب و ثقافت اور میدانِ علم و ادب سے لیا۔ تعصب، فرقہ پرستی،

بغض وعناد، خوشامد، غیبت وچغل خوری، مہنگائی، ملاوٹ، سستی شہرت، جاہ طلبی، رشوت خوری، انسانی اقدار کی پامالی، رشتوں کی شکست وریخت وغیرہ سینکڑوں موضوعات پر انھوں نے قلم اٹھایا لیکن جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ان کی بہترین ظرافت کا بیش تر حصّہ وہ ہے جس کا مواد دنیاے ادب سے لیا گیا ہے۔ ادبی دنیا میں جو داو پیچ، سیاست، سازش، گروہ بندیاں اور جوڑ توڑ دیکھنے کو ملتے ہیں ان پر پاشا صاحب نے بڑی خوبصورتی اور کامیابی سے قلم اٹھایا ہے۔ ادبی موضوعات پر اتنی تفصیل اور اتنے موثر پیرایے میں آزادی کے بعد کسی دوسرے ظرافت نگار نے نہیں لکھا۔

احمد جمال پاشا کے لہجے میں تازگی، موضوعات میں ندرت اور جدّت نظر آتی ہے۔ وہ مزاح میں دقّت نظری، اعتدال، برجستگی اور شوخی سے کام لیتے ہیں۔ ان کی یہ ساری کاوشیں شعوری نظر آتی ہیں جن میں شگفتگی، روانی اور لہجے کا دھیما پن نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے مضامین میں یہ خوبیاں اس وجہ سے بھی ہیں کہ علم وادب اور لکھنے پڑھنے سے ان کی وابستگی بنیادی تھی۔ وہ اردو کے ظریفانہ ادب کا بھی پابندی سے مطالعہ کرتے تھے جس نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ دوسرے ان کے یہاں سماجی برائیوں، خامیوں، کمزوریوں اور استحصال وغیرہ کا علم بہت وسیع ہے۔ علاوہ ازیں وہ مختلف علوم وفنون میں گہری دل چسپی لیتے رہے اور اسی لیے وہ سماجی ناہمواریوں اور تبدیلیوں کے بارے میں بے حد باخبر تھے۔ ذاتیات، گروہ بندیوں اور ادبی مصلحتوں یا جاہ ومنفعت وغیرہ سے دور بھاگتے تھے اور گوشہ نشینی کو پسند کرتے تھے۔ ادبی کانفرنسوں، ہنگاموں اور بے جا نام ونمود سے دور رہ کر اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اور محنت لکھنے پڑھنے پر صرف کرتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کے وہ پہلو تھے جن کا اثر ان کی تحریروں پر بھی پڑا اور اسی لیے ان کی ظرافت میں ہر جگہ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ قدرت نے ان کو جو صلاحتیں ودیعت کی تھیں ان کا انھوں نے بڑے سلیقے سے استعمال کیا۔ پروفیسر محمود الٰہی نے بالکل درست لکھا ہے:

> ''احمد جمال پاشا کا مشاہدہ جتنا قوی اور تیز تھا اس سے کہیں زیادہ قوی اور تیز ان کی وہ صلاحتیں تھیں جو مشاہدے کو طنز ومزاح میں بدل دیتی ہیں۔ پاشا کا مزاح صرف ادب تک محدود نہیں ہے وہ کبھی کبھی اسے علم کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں اور ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ علم اور مزاح دونوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں''۔

(انتخاب مضامین احمد جمال پاشا۔ مرتبہ:
عابد سہیل۔ پیش لفظ : محمود الٰہی ص ۳)

تحریف نگاری

احمد جمال پاشا نے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ پیروڈی لکھنے پر بھی توجہ صرف کی اور اپنی ادبی زندگی کی ابتدا میں ہی بہترین پیروڈیاں قلم بند فرمائیں۔ ان کے پہلے مجموعے ''اندیشۂ شہر'' میں نصف سے زیادہ پیروڈیاں ہی ہیں لیکن اس کتاب کے مبصروں اور پاشا صاحب کے فن پر لکھنے والوں کی اکثریت ان پیروڈیوں کی نشاندہی سے قاصر رہی ہے اور ان کا شمار پیروڈی کے بجاے مضامین میں کیا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بیش تر نقاد پیروڈی کے فن سے پوری طرح آگاہ نہیں اور اسے صرف طرزِ تحریر کی تقلید سمجھتے ہیں حالانکہ کسی اہم تاریخی واقعے کا سہارا لے کر بھی پیروڈی قلم بند کی جا سکتی ہے، تاریخ اور ادب کے مشہور ومعروف کرداروں کو بھی ہم تحریف کا جامہ پہنا کر عہدِ حاضر کے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں اور کسی مخصوص صنفِ ادب کی نقالی کے ذریعہ بھی پیروڈی ضبطِ تحریر میں لائی جا سکتی ہے۔

میر جعفر زٹلّی سے ملّا رموزی تک تحریف کے فن پر جو تجربے کیے گئے تھے اور روایتاً جس قسم کی تحریفیں لکھی جا رہی تھیں ان کا بڑا خزانہ پہلے سے ''اودھ پنچ'' میں موجود تھا جس نے آگے چل کر تقلید اور تکرار کی صورت پیدا کر لی تھی اور تقریباً ہر تحریف نگار سند باد جہازی اور چہار درویش وغیرہ کی تقلیداً پیروڈی کر لیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں احمد جمال پاشا نے بالکل اچھوتے اور نئے موضوعات پر بالکل نئے انداز میں ایسی پیروڈیاں لکھیں جن میں مزاح اور تحریف بجاے تحریف کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا بلکہ اس سے سماجی شعور، بصیرت اور زندگی کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا گیا ہے۔ یہ رجحان ان کے یہاں اتنا توانا بن کر نمودار ہوتا ہے جو دوسرے تمام تحریف نگاروں پر حاوی اور قوی ہے۔

احمد جمال پاشا کی پیروڈیوں کے مطالعے کی روشنی میں انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
(۱) ایسی پیروڈیاں جن میں کسی مصنف کے طرزِ اسلوب کا خاکہ اڑا کر اس کی خامیاں اجاگر کی گئی ہیں اور (۲) وہ پیروڈیاں جن میں طرزِ تحریر کی تقلید کے علاوہ معاشرے کی خامیوں کا بھی مذاق اڑا گیا ہے۔
پاشا صاحب ادیبوں کے اسلوب کی نقالی کا حیرت انگیز ملکہ رکھتے ہیں۔ ''طرزِ نگارش میری''،

''کپور......ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' اور ''گلیمر بوائے کا خط قرۃ العین حیدر کے نام'' اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ ''طرزِ نگارش میری'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تصنیف ''آشفتہ بیانی میری'' کی تقلید میں لکھی گئی پیروڈی ہے۔ اس میں رشید صاحب کے مخصوص اسلوب کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔ بات میں بات نکالنا اور پھر ہر ایک بات میں نئی بات پیدا کرنا، اکثر اپنے موضوع سے بہک جانا، الفاظ کی صوتی حیثیتوں سے مخصوص مزاحیہ مگر فکر انگیز فضا پیدا کرنا رشید احمد صدیقی کا طرۂ امتیاز ہے۔ احمد جمال پاشا نے ان تمام باتوں کی عکاسی بہت فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میرا تجربہ تو بتاتا ہے کہ لوگ سیر وتفریح کے بہانے گھر کا سودا خرید لاتے ہیں اور خرید وفروخت کے بہانے سنیما دیکھ آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں خرید وفروخت ہوگی وہاں لوگ سنیما دیکھیں گے اور جہاں پر سیر سپاٹے کے امکانات ہوں گے وہاں لوگ خرید وفروخت کرتے نظر آئیں گے۔ خرید زیادہ فروخت کم، میرے خیال میں یہ عجیب وغریب بات ہے جو عجیب تو کم مگر غریب زیادہ ہے......دراصل میں دیہاتی ہوں تعظیماً شہری کہلاتا ہوں اور اخلاقاً تعلیم یافتہ۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ مجھے تعلیم یافتہ دیہاتی سمجھیں یا دیہاتی تعلیم یافتہ۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں دیہاتی پہلے ہوں اور تعلیم یافتہ بعد میں یا تعلیم یافتہ پہلے اور دیہاتی بعد میں۔ خدا آپ لوگوں کا بھلا کرے کہ اس وقت مجھے دیہات اور تعلیم دونوں یاد آ گئے لیکن آپ معاف فرمائیں۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ میں کچھ غیر متعلق باتیں کرنے لگا ہوں''۔

اس پیروڈی کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ ۱۹۵۷ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پیروڈی کانفرنس میں پڑھی گئی جس میں رشید احمد صدیقی بہ نفسِ نفیس موجود تھے وہ اسے سن کر بہت محظوظ ہوئے اور انفرادی طور پر انعام میں اپنی کتابوں کا مکمل سیٹ پاشا صاحب کو دیا۔

اس سلسلے میں سب سے نفیس کاوش ''کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' ہے۔ اس پیروڈی کو ادبی دنیا نے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر سید احتشام حسین، سعادت علی صدیقی اور پروفیسر قمر رئیس کی پسندیدگی کے علاوہ خود کنھیا لال کپور نے اسے ''طنز ومزاح کا لازوال شاہ کار'' قرار دیا تھا۔ اس میں رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، عبادت بریلوی اور قاضی عبدالودود کے طرزِ خاص کی پیروڈی کی گئی ہے۔ ''اندیشۂ شہر'' کی اس تحریف میں وہ حصے شامل

نہیں کیے گئے ہیں جو پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مسعود حسن خاں کے طرز کی تقلید میں لکھے گئے ہیں اور ''اسکالر'' کے پیروڈی نمبر میں شامل ہیں۔ اس پیروڈی میں احمد جمال پاشا فن کی اس بلندی پر جا پہنچے ہیں جس کے آگے کسی فن کار کی رسائی نہایت دشوار ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحریروں کا مذاق یوں اڑاتے ہیں:

> ''مجھے یہ دیکھنا ہے کہ کپور کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں، وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ ومزاحیہ ہوتے ہیں ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جس میں میری دانست میں طنز ہے ان مضامین میں طنز ہے۔ طنز......میں یہ کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں طنز ہے......یہی وہ طنز ہے جس سے کپور اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آجاتا ہے دوسرے معنوں میں یوں سمجھیے کہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہو اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے اور کچھ نہ ہو......میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ طنز ہے یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے جس کے لیے قسم خدا کی اب میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے''۔

اس پورے اقتباس سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کپور کے یہاں طنز ہے۔ یہ بات ایک جملے میں کہی جا سکتی تھی لیکن اس کے لیے اس قدر طوالت اور پیچیدہ بیانی سے کام لیا گیا اس پر افسوس کا اظہار بھی ہے کہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں۔ دراصل عبادت بریلوی کے یہاں بے جا تکرار اور باتوں کو خواہ مخواہ طول دینے کا جو عام رجحان ملتا ہے اور جس کی بنا پر پیروڈی کی جو فضا پیدا ہو جاتی ہے، احمد جمال پاشا نے اسے مبالغے کا سہارا لے کر نمایاں کیا ہے اور اس طرح کی لایعنی طول بیانی کی تنقید کی ہے۔

مذکورہ پیروڈی میں ہی پروفیسر کلیم الدین احمد کے اسلوب اور اندازِ نقد کو بہت اچھی طرح پیش کیا گیا ہے۔ کلیم صاحب کے یہاں انتہا پسندی کا رجحان ہے وہ دوٹوک انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ ادیبوں اور نقادوں کی بیک وقت تعریف وتوصیف اور مذمت کرتے ہیں۔ ان سب کی جلوہ گری اس پیروڈی میں موجود ہے۔ ''اردو میں طنز ومزاح کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ صفر کا نقطۂ خیال ہے یا زبرے

کی موہوم کمر......ان کتابوں کے دیباچے پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے......ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب تک ''نرم گرم'' سے بہتر کارنامہ نہیں پیش کیا۔ یہ خیال کہ ''نرم گرم'' اردو میں طنز وظرافت کا بہترین کارنامہ ہے نہایت حوصلہ شکن ہے......ان کی وقعت مشاعروں کی سبحان اللہ سے زیادہ نہیں''۔
پیروڈی نگار نے کلیم الدین احمد کے جملوں اور خیالات میں ہی ذرا سی تبدیلی کر کے اپنا مقصد پورا کر لیا ہے اور اسی تبدیلی نے مزاح کی کیفیت کو ابھارا ہے۔ کلیم الدین احمد کے برعکس قاضی عبدالودود کے اسلوب کی تقلید آسان نہیں۔ قاضی صاحب کسی مخطوطے یا کسی کتاب پر تبصرہ کریں وہ مسلسل اس طرح اشاروں سے کام لیتے ہیں کہ بعض اوقات انھیں سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ان کے جارحانہ اندازِ بیان سے بھی لوگ ہراساں رہتے ہیں۔ پاشا صاحب نے قاضی صاحب کے اسلوب کی جو تحریف پیش کی ہے وہ لائقِ تحسین ہے:

> ''اس مخطوطے کو اختلاط طباعت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے۔ اس لیے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا۔ اقتباس بالا ص: ۹۲، سطر ۲۰ خط جو میں نے اپنی خوش دامن کو تحریر کیا تھا حاشیہ نمبرے مجھے بانکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ بوسیدہ اور سقیم حالت میں کپور کے مضامین کا مل گیا ہے۔ خاندان میں جملہ پرسانِ حال کو اس کی خوش خبری پہنچا دو کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں مصروف ہوں...... یہ مہملات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو ۲۲x۱۲ فٹ کے ۶۲۲ رم صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۷ رسطر فی صفحہ اب بھی مل جاتے ہیں مگر نایاب نہیں......
>
> کتاب کے صفحہ ۳۴ سطر ۳۱ میں 'لا' کا غلط استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے مصنف کی تنبیہہ ضروری ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے کیونکہ اس کو معاف کرنے پر بھی اعتراض ہرگز رفع نہ ہوگا پھر سند تو قطعی غلط ہے۔ ابجد کے لحاظ سے کتاب کا پہلا لفظ الف سے شروع کرنے کے بجائے 'ے' سے شروع کیا گیا ہے۔ مصنف سخت تنقید کا مستحق ہے''۔

اس اقتباس میں قاضی صاحب کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر سخت گرفت کے ساتھ ساتھ ان کے لب و لہجے اور طرزِ تحریر کو اس حسن وخوبی کے ساتھ سمو دینا احمد جمال پاشا ہی کا حصہ ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ پر ان کی گرفت کس قدر مضبوط ہے۔ قاضی صاحب کے یہاں عبارت کی جو خشکی اور بے کیفی پائی جاتی ہے اسے اجاگر کرنے کے لیے اتنا مہذب لیکن ظرافت آمیز

پیرایۂ بیان اختیار کرنا ساتھ ہی توازن اور احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہ دینا، یہ چیز فنی ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس پیروڈی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فضل جاوید نے لکھا ہے:

> ''ایک ہی شخصیت پر جب مختلف تنقید نگار حملہ آور ہوتے ہیں تو بعض کو اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں اور بعض صرف اس کی خامیوں اور نقائص پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ کچھ اس کی مجموعی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہیں اور بعض ایسے بھی ناقد ہوتے ہیں جو صرف اپنے ہی اصول کی روشنی میں ہر چیز کو پرکھنا چاہتے ہیں۔ اس مضمون (کذا) میں ان سب نقادوں کے نشانِ ملامت بنے ہوئے کنھیا لال کپور الگ کھڑے ہوئے مسکراتے ہیں اور ادب ایک انوکھے انداز کی پیروڈی سے مالا مال ہو گیا''۔(۱)

مختلف مصنفین کی طرزِ نگارش کا خاکہ اڑانے کے ضمن میں ''گلیمر بوائے کا خط'' بھی آپ اپنی مثال ہے۔ اس میں ممتاز ادیبہ قرۃ العین حیدر کے مخصوص اندازِ بیان، شعور کی رو کی تکنیک کو برتنے کے عمل اور جا و بے جا انگریزی الفاظ کے استعمال کو جو سماعت پر بار گزرتے ہیں، ہدفِ طنز بنایا گیا ہے اور کمال یہ ہے کہ مذکورہ مصنفہ کے اسلوب کی پیروڈی اس خوبی سے کی گئی ہے کہ اگر اس کا مطالعہ بہ نظرِ غائر نہ کیا جائے تو تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ قرۃ العین حیدر کی نہیں ہے۔ نقل پر بالکل اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔
قاضی عبدالودود اور قرۃ العین حیدر جیسے دشوار مصنفین کے اسلوبِ نگارش کی تقلید کرنا اور تحریف نگاری کے اس پلِ صراط سے بہ خیر خوبی گزر جانا کمالِ فن کی دلیل ہے۔

> ''اردو کے نامور ادبی ناقدین پر ان کی یہ پیروڈیاں ان کی طبیعت کی شوخی، ذہانت اور زبان پر قدرت کی دلیل ہیں۔ یہ انبساطی (اور استہزازی) کیفیت کی حامل ہیں اور اردو کے نثری سرمایے میں یادگار اضافہ......ان کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ اچھے مزاح نگار کی طرح الفاظ شناس بھی ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس چیز کی پیروڈی کر رہے ہیں''(۲)

احمد جمال پاشا نے اپنی تصنیف ''غالب سے معذرت کے ساتھ'' میں جو پیشِ لفظ لکھا ہے اس میں غالب کے اسلوب کی پیروڈی کی ہے۔ اندازِ تحریر ایسا ہے جیسے غالب نے اس کتاب کے لیے جنت سے پیشِ لفظ بھجوایا ہو۔ شگفتگی وہاں مزید بڑھ جاتی ہے جب غالب اپنی اور خلد آشیانی مزاح نگاروں کی خیریت لکھنے کے بعد بقیدِ حیات مشہور ظرافت نگاروں کو اپنے پاس جلد بھیجنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ یہ

پیروڈی خالص مزاح کا نمونہ ہے جس کا مقصد محض تفریح ہے۔

''لذتِ آزار'' کے فلیپ پر پاشا صاحب کے فن سے متعلق چند سطریں قلم بند ہیں پہلی نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی صاحبِ نظر کے خیالات ہیں لیکن تحریر کے خاتمے پر ''ولیم شیکسپیئر'' کا نام دیکھ کر ہنسی آنے لگتی ہے۔ تحریف کے اس نادر انداز کے ذریعہ ان لوگوں پر چوٹ کرنا مقصود ہے جو اپنی کتابوں پر نامی گرامی ادیبوں کی رائے حاصل کرنے کے لیے رات دن ایک کیے رہتے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ یہاں جو عبارت درج ہے اس میں نہ مزاح ہے اور نہ تحریف کی کوشش۔ صرف شیکسپیئر کا نام لکھ دینے سے پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ یہاں پیروڈی نگار نے ایک تیر سے دو شکار کیا ہے۔ ایک طرف تو اس نے بذاتِ خود اپنے فن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا دوسرے ان لوگوں پر طنز بھی کر دیا جو کتاب سے زیادہ مقدمے اور پیشِ لفظ کی فکر میں رہتے ہیں۔

طرزِ نگارش کی تقلید سے ہٹ کر جب ہم احمد جمال پاشا کی ان تحریفوں کا جائزہ لیتے ہیں جن میں انھوں نے معاشرے کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے تو یہاں ان کے فن کے جوہر زیادہ کھلتے نظر آتے ہیں۔ تحریف کے پردے میں انھوں نے طنز و مزاح کا ایسا مرکب تیار کیا ہے جس کی نظیر ملنی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایسی پیروڈیوں میں سب سے اہم ''رستم امتحان کے میدان میں'' ہے۔ یہ پاشا صاحب کی پیروڈیوں میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے مشہور عالمی شاعر فردوسی کی شہرۂ آفاق تصنیف ''شاہ نامہ'' کی پیروڈی کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ''شاہنامہ'' منظوم ہے اور یہ پیروڈی نثری ہے۔ اسے ہم اردو نثر کا رزمیہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس طویل ترین پیروڈی میں ہندستانی تعلیم گاہوں کی خرابیوں، اساتذہ کی کمزوریوں، طریقۂ تعلیم اور نصاب کی خامیوں سے لے کر اسکول میں داخلہ کرانے، اپنے نام کی تصدیق اور امتحان کی بدنظمی وغیرہ سب کا مذاق اڑایا ہے۔ ہندستانی اسکولوں کو میدانِ جنگ تصور کر کے احمد جمال پاشا نے فن کا جو جادو جگایا ہے اس نے پیروڈی کو ایک نئے افق سے آشنا کر دیا ہے۔

''غدر سن انیس سو ستاون کے اسباب'' ۱۸۵۷ کے غدر کی صد سالہ برسی کے موقع پر لکھی گئی تاریخ نویسی کی پیروڈی ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی لکھتے ہیں:

''غدر ۱۸۵۷ کے اسباب'' (کذا) میں افواہ اڑانے والوں کی ٹانگ کھینچی گئی ہے'' (۳)

یہ خیال صحیح نہیں، اس تاریخی نوعیت کی پیروڈی کے پسِ پردہ ملک کی موجودہ صورتِ حال پیش کی گئی ہے۔ اس تصویر کشی میں حقیقت کو اس کے برعکس پیش کیا گیا ہے۔ غدر کے اسباب کیا تھے۔ اس کی ابتدا کیسے ہوئی، لوٹ مار، قتلِ عام، باغیوں میں پھوٹ، گرفتاریاں اور معافیاں، تاریخی مقدمے، باغیوں

کے بیانات اور سزائیں...... ان تمام باتوں کی نشاندہی اس پیروڈی میں موجود ہے۔ آزادی کے بعد ایک مخصوص طبقے کی ذہنیت میں جو بگاڑ آیا اور اس کے منہ کو ۴۷ کے فسادات کا جو خون لگا اس کے اثر سے بلوہ، فساد اور خون ریزی ان کے رگ و پے میں حلول کر گئی۔ ملک کا امن و امان اسے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا۔ قومی سالمیت، اتفاق و اتحاد اور یکجہتی کو دیکھ کر ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے ہیں۔ عام بے روزگاری، افلاس کی وبا، تعلیمی اداروں کا زوال، ڈگریوں کی خرید و فروخت، فرقہ پرستی کا کھلا کھیل، لیڈروں کی بے حسی، زبانی ترقی کے وعدے، بڑھتی ہوئی مہنگائی جیسے مسائل پر پاشا صاحب نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ پوری پیروڈی پڑھ جائیے اس کی اوپری سطح پرسکون نظر آتی ہے لیکن اندر ہی اندر طنز کی لہریں بالکل اسی طرح موجود ہیں جیسے پطرس کے مضمون ''انجام بخیر'' میں۔ یہ مثال دیکھیے:

> ''ظلم و ستم کی حد یہ تھی کہ عوام طوائفیں چاہتے تھے اور حکومت ان کے گلے بیویاں باندھنا چاہتی تھی...... ڈگریاں ترکاری کی طرح سڑکوں پر اس طرح بکتیں جس طرح آغا لوگ دوائیں بیچتے ہیں۔ سوائے چند دیہاتیوں کے جو گھر سجانے کے لیے لے جاتے، عام لوگ انھیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے یا معصوم بچے پتنگیں بنا کر اڑاتے''۔

کمرۂ عدالت میں باغیوں کے قائد منگل پانڈے کے یہ چونکا دینے والے بیانات بھی ملاحظہ فرمائیے:

> ''کیا حکومت یہ جاننا چاہتی ہے کہ منگل باغی کیوں ہوا۔ کیا حکومت کو علم نہیں کہ اس نے روپیہ کے چالیس آنے اور ڈھائی سیر کے بجائے دس سیر کا اناج کر دیا...... میں پوچھتا ہوں کہ حکومت نے اس کے لیے عوام کے نمائندوں سے بھی رائے لی تھی...... جب ہر چیز سستی اور آسان کر دی جائے گی تب ہماری نسل میں تلاشِ معاش و فاقہ مستی کا خمیر اور جستجو کا مادہ کہاں سے آئے گا۔ کیا حکومت کو علم نہیں کہ روزگار دلانے والے دفتروں نے ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کو زبردستی روزگار دلا کر ہمارے سینوں پر کدال اور پھاؤڑے وٹریکٹر نہیں چلائے۔ ہماری معصوم حسرتوں نے ہمارے ناگاساکی اور ہیروشیما بنانے کے سنہرے خوابوں کو مسمار نہیں کیا؟...... کیا ہمارے وزیروں اور لیڈروں نے اپنے پیٹ کاٹ کر اور پیدل دورے کر کے ہماری ناک دوسرے ممالک کے سامنے نیچی نہیں کی...... کیا حکومت نے چوریوں،

ڈاکوؤں اور بے ایمانیوں کو ختم کر کے جیل، پولیس اور عدالتوں کو مفلوج نہیں کر دیا''۔

منگل پانڈے کا یہ بیان ہمیں غور وفکر پر مجبور کرتا ہے کہ آج ہمارے یہاں کیا ہو رہا ہے اور ہم کس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں۔ احمد جمال پاشا نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے تحت الثریٰ کو عرشِ معلّٰی اور سیاہ کو سفید بنا کر پیش کیا ہے لیکن جھوٹ کو سچ کا لبادہ اڑھا دینے سے حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ یہاں وہ وعظ نہیں کرتے آئینہ دکھاتے ہیں۔ بغور دیکھیے تو بقولِ غالب قیس تصویر کے پردے میں عریاں نکلتا ہے۔ اردو میں پیروڈی کا یہ انداز بالکل نیا اور انوکھا ہے۔

''آموختہ خوانی میری'' پاشا صاحب کی ایک دل چسپ اور کامیاب پیروڈی ہے۔ اس میں انھوں نے ان ادیبوں کو اپنا نشانہ بنایا ہے جو خودنوشت سوانحِ حیات کے بہانے آپ اپنی قصیدہ خوانی کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں کہ دنیا کی ساری خوبیاں انھیں کی ذات میں موجود ہیں۔ وہ اعلا اور افضل ترین خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بچپن سے ہی کھیل کود سے دور رہ کر علم وادب سے سروکار رکھنا ان کی ہابی تھی۔ ادبی محفلوں، علمائے کرام، بڑے بزرگ اور باکمال اصحاب کی صحبتوں سے لطف اندوز ہونے کا چسکہ شروع سے ہے۔ پیروڈی نگار ایسے لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ لوگ شیر خواری کے عالم سے ہی شیشی کا دودھ پی پی کر فلسفیانہ رسائل پڑھتے تھے۔ یہ عظمت بھی ملاحظہ ہو:

> ''چوتھی جماعت میں دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ صاحبِ دیوان شاعر بھی ہو چکا تھا اور ساتھ ہی ساتھ تمام اساتذہ کے دیوان کا حافظ بھی۔ بہ حیثیتِ طالبِ علم اسکول میں میرا کوئی ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ اول پاس ہوتا۔ اس زمانے میں میں نے آفاقی ادب کے تمام قابلِ ذکر ناول اور فلسفے کی بیش تر اہم کتابیں چاٹ ڈالی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر میری وسعتِ مطالعہ پھیل کر خود میرے لیے پیچیدگیاں پیدا کرنے لگی تھی''۔

شیشی سے دودھ پی کر فلسفیانہ رسائل پڑھنا اور فلسفہ وحکمت کی محفلوں میں شریک ہونا، چوتھے کلاس میں صاحبِ دیوان شاعر بن جانا اور آفاقی ادب کو چاٹ ڈالنا، ایسی باتیں ہیں جنھیں پڑھ کر ہونٹوں پر بے اختیار تبسم نمودار ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کم عمری میں یہ عظمتیں باعثِ پیچیدگی تو ہوں گی ہی۔ حد درجہ غلو سے کام لے کر باتوں کو اس قدر پھیلایا گیا ہے کہ آنکھیں چرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ لوگ طنز

کا شکار ہوئے ہیں جو خودنوشت میں بے جا تعریف اور مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اس پیروڈی کا نشانہ بیش تر ایسے ہی مشاہیر ہیں۔

''مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں'' کا شمار بھی اچھی پیروڈیوں میں ہوگا۔ اس میں احمد جمال پاشا نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' کے مشہور کردار مرزا ظاہر دار بیگ کی تحریف کی ہے اور اس کے سہارے موجودہ سماج کے ان قزاقوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو نیک سیدھے سادے اور معصوم لوگوں کو اپنی عیاری، دروغ بیانی اور حیلہ سازی کے جال میں پھانستے ہیں اور اپنی چرب زبانی، لفاظی اور جھوٹی شان وشوکت دکھا اور جتا کر ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ''توبۃ النصوح'' میں جس طرح ظاہر دار بیگ کلیم کو اپنی لچھے دار باتوں کے دام میں اسیر کر کے اپنا مفاد حاصل کرتا رہتا ہے۔ سماج میں وہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔

''درخواستیں مطلوب ہیں'' میں اشتہار کی پیروڈی کی گئی ہے اور اس کے سہارے ابن الوقت ادیبوں کا پول کھولا گیا ہے۔ یہ اشتہار ''فن کار اینڈ فن کار کمپنی لمیٹڈ'' کی جانب سے جاری کیا گیا ہے اور اس میں یہ شرائط پیش کی گئی ہیں کہ وہی ہونہار ادیب، فن کار وغیرہ درخواست دے سکتے ہیں جو گروپ بنانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ایک گروپ سے دوسرے گروپ میں چلے جانے کے گر سے واقف ہوں۔ چندہ جمع کرنے، شراب پینے، مرعوب کرنے، اپنی شورہ پشتی وسرداری قائم رکھنے، ملکی وغیر ملکی نمائندگی کے لیے بن بلائے پہنچ جانے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ چند خاص پابندیاں پیروڈی نگار کی زبانی سنیے:

> ''درخواست کے ساتھ بڑے آدمیوں یا بڑے ادیبوں، نقادوں، کھاتے پیتوں، پیٹ بھروں کی سفارشیں آنا ضروری ہیں...... محض پڑھنے لکھنے کے بل بوتے پر کوئی صاحب درخواست دینے کی زحمت گوارا نہ کریں ورنہ بعد میں ان کو خاصی مایوسی ہوگی...... نوٹ: درخواست کے ساتھ رشوت کے روپے، سفارشی خطوط، اساتذہ سے کہلوایا ہوا کلام، لکھوائی ہوئی سندیں...... بھیجنا ہرگز نہ بھولیں''۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ تحریف نگار نے ان لوگوں پر چوٹ کی ہے جو نوکریوں میں امیدوار کی ذاتی لیاقت کو نہیں دیکھتے بلکہ ان کی نظروں میں اصل چیز سفارش اور رشوت ہوتی ہے۔ پاشا صاحب نے ایک کڑوی سچائی کو بڑی معصومیت اور فن کاری کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

احمد جمال پاشا ''قومی آواز'' میں ملازمت کے دوران اس کا مزاحیہ کالم ''گلوریاں'' لکھتے تھے۔ میرے پاس اس کے جتنے تراشے ہیں ان میں چند مختصر پیروڈیاں بھی ہیں۔ ان میں ''درخواستیں مطلوب ہیں''

کے رنگ میں بھی ایک پیروڈی ''اشتہار'' کے نام سے موجود ہے۔ یہ اشتہار چھپے چیزوں کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ ''درخواستیں مطلوب ہیں'' کی بہ نسبت اس پیروڈی میں شگفتگی کا عنصر زیادہ ہے۔ ''آپ کی قسمت کا ایک ہفتہ'' اور ''زائچۂ سالِ نو'' مختصر پیروڈیاں ہیں لیکن ان میں نیا پن کے ساتھ طنز کی کاٹ بہت تیز ہے۔ ''آپ کی قسمت......'' میں اخباروں میں کی جانے والی پیشین گوئیوں کی تحریف مزاحیہ انداز میں کی گئی ہے۔ اس طرح کی پیشین گوئیاں ہفتے میں ایک بار حروفِ تہجی یا سیاروں کے نام کے حساب سے شائع ہوتی ہیں جنھیں لوگ اپنے نام کے پہلے حروف یا اپنے راشی پھل کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ ''زائچۂ سالِ نو'' قومی آواز میں یکم جنوری ۱۹۶۷ کو شائع ہوئی تھی۔ یہ احمد جمال پاشا کے فن کا بہترین نمونہ ہے۔ انھوں نے جو زائچہ بنایا ہے اس کے علاوہ مختصر ترین الفاظ اور جملوں کے ذریعہ بڑے کام کی باتیں کہی ہیں۔ طنزیہ لہجے نے اس کی اثر آفرینی میں اضافہ کر دیا ہے مختلف مسائل پر نجومی نے کیا کہا ہے اسے ملاحظہ فرمائیں:

> ''حکومتوں کو ہلا دینے والے اسکینڈل ہوں گے......امن کے نعروں کو بلند کرنے کے لیے سرد جنگ گرم لڑائی اور جنگ بندیاں ہوں گی......مہنگائی، قحط اور پڑھے لکھوں کی بے روزگاری کے نتیجہ میں ترقیاتی منصوبوں کی بھرمار ہوگی......ریڈیائی خبرنامے دیوبانی زبان میں نشر کیے جائیں گے جن کو سننے اور سمجھنے والوں کی کل تعداد ۵۰۰ افراد پر مشتمل ہوگی جو سب کے سب وزیر باتدبیر ہوں گے لہٰذا خبر کو سرکاری راز کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ رشوت، چور بازاری، اقربا پروری، تعصب، تنگ نظری اور علاقائی عصبیت کی روک تھام کے لیے امسال ایک نگراں وزارت کا قیام عمل میں آئے گا اور اس محکمے کی چوکی داری اور کان گوشی کے لیے ایک نگراں کمشنر مقرر کیا جائے گا جن کی وجہ سے ایسے معاملات سامنے آیا کریں گے جن میں نگراں وزارت کے تعاون سے بدعنوانیاں کی گئی ہوں گی......اقلیت کے غازی سائنس، ٹکنالوجی اور تجارت سے بیگانہ رہیں گے۔ اکثریت سے بھائی چارگی کی سبیل نکالنے، زبان، تہذیب، ادب، ثقافت اور مذہب کو محفوظ رکھنے اور آگے بڑھانے کے عملی پاپڑ بیلنے کی بجائے محض نعتیں سنتے اور نصیحتیں کرتے رہیں گے''

احمد جمال پاشا نے اس پیروڈی میں تقریباً بائیس برس قبل جن مسائل کو بیان کیا تھا وہ جوں کے توں برقرار ہیں اور باتوں کو چھوڑیے ہندستان میں اقلیتوں کے مسائل پر پاشا صاحب نے کتنی اہم اور

دیانت دارانہ رائے دی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملک کے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کی تنزلی کے اسباب سے پوری طرح واقف تھے اور طنز و مزاح کے پیرایے میں اس جانب ہماری توجہ مبذول کرانے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ صرف خامیوں کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ ہماری رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

احمد جمال پاشا کی ایک اور قابلِ ذکر پیروڈی ''شرح انتخابِ غالب'' ہے۔ غالب کے کلام کی مزاحیہ شرحیں کئی لوگوں نے لکھی ہیں ان میں شوکت تھانوی اور فرقت کاکوروی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں حضرات کے یہاں تحریف سے زیادہ تفریح کا رجحان ہے لیکن احمد جمال پاشا نے اس مختصر پیروڈی کے ذریعہ ویسے لوگوں پر چوٹ کی ہے جو غالب صدی کے موقعے پر بغیر غور و فکر کیے صبح شام مقالے اور کتابیں تصنیف فرما رہے تھے۔ اس صورتِ حال کی عکاسی پیروڈی کے ابتدائی حصے میں دیے گئے تعارف، مقدمہ اور تمہید سے ہوتی ہے۔ پاشا صاحب غالب کے اشعار کی تشریح میں دور کی کوڑی لائے ہیں اور نام نہاد ماہرینِ غالبیات کو دعوتِ فکر دی جو غالب کے اشعار کی تشریح و توضیح کے بہانے بھان متی کا کنبہ جوڑتے رہتے ہیں۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اس شعر کی تشریح آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

> ''جس طرح کتے کا کاٹا پانی سے ڈرتا ہے۔ اسی طرح آئینہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ مجھے انسانوں نے کاٹا ہے اور آئینہ میں اپنی صورت میں انسان دکھائی پڑتا ہے اور دوسروں سے کیا خود اپنی ذات سے تنفر ہے۔ یہ شعر مرزا نے کلکتہ میں کہا تھا۔ جہاں مرزا قتیل نے شاعری کے میدان میں ان کو کاٹ کھایا تھا اور برہانِ قاطع کے معرکہ کے بعد یہ اپنے سایے تک سے ڈرنے لگے تھے کہ وہ ان پر حملہ کر بیٹھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں مرزا نے پانی پینا تک چھوڑ دیا تھا اور محض نانِ خشک اور شعر و شاعری پر گزارا تھا''۔

پاشا صاحب نے ''چند حسینوں کے خطوط'' کے عنوان سے پیروڈیوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا ان میں سے ''گلیمر بوائے کا خط قرۃ العین حیدر کے نام'' کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ باقی تحریفوں میں ''کتے کا خط پطرس کے نام''، ''گدھے کا خط کرشن چندر کے نام''، ''خوجی کا خط سرشار کے نام''، ''میر کا خط

میریوں کے نام''، ''پڑھے لکھوں کے خطوط محمد فاضل کے نام'' اور ''مفت خوروں کے خطوط ایڈیٹر کتاب کے نام'' اہم ہیں۔ ان سب تحریفوں میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور ادبی برائیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں مصنف پوری طرح کامیاب ہے۔ دلچسپی کی فضا بھی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ پطرس کا کتا، کرشن چندر کا گدھا اور سرشار کا خوجی اردو کے جانے پہچانے کردار ہیں۔ انھیں تحریف کا جامہ پہنانے کا خیال ہی نرالا ہے۔ پاشا صاحب کے علاوہ کسی اور ظرافت نگار کے یہاں ایسی چیزیں موجود نہیں ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر کردار کی خصوصیت کو باقی رکھتے ہوئے پیروڈی نگار نے اپنا کام نکالا ہے۔ لہجہ ایسا ہے کہ کوئی بھی بات ذہن کو گراں نہیں گزرتی۔

آخر میں ''چین و بنگال کا جادو''، ''طلسماتِ الّو'' اور ''تسخیرِ دل'' کا ذکر ضروری ہے۔ یہ احمد جمال پاشا کی بہترین پیروڈیاں ہیں۔ یہاں ان کا فن ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ اردو ادب میں یہ اپنی نوعیت کی انوکھی اور منفرد تحریفیں ہیں۔ ان کے مطالعے سے مصنف کی باریک بینی، موضوعات کی بوقلمونی اور جولانیِ طبع کا بہ حسن و خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان طلسماتی پیروڈیوں میں گنڈے تعویذ، جادو، ٹونے، ٹوٹکے، تنتر منتر اور مختلف دیگر عملیات کے پردے میں معاشرے میں پھیلے ہوئے توہمات اور برائیوں کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت نے مصنف کو چومکھی لڑنے کا موقع فراہم کیا ہے جس سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ معاشرے کی ناہمواریوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان سفید پوش عالموں اور جادوگروں پر بھی چوٹ کی گئی ہے جو خود ساختہ تعویذات اور مہمل منتروں کی بنیاد پر سماج میں گمراہی پھیلاتے اور اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ ''تسخیرِ دل'' میں بہ طورِ خاص نئی تہذیب کے دلدادہ ان نوجوانوں کی ذہنیت کی عکاسی ہے جو جنس پرست ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ لڑکیوں کے گھروں کے چکر کاٹنا، محبوب کی تلاش میں اسکول اور کالج کے پھیرے لگانا اور حصولِ مدعا کے لیے نت نئے ہتھکنڈے اختیار کرنا ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

روزگار مل جائے گا:

''اگر اتفاق سے کوئی بے کار ہو، روزگار کی صورت نہ ہو تو نجومی یا جنتری سے سورج گرہن معلوم کرے۔ گرہن سے ۳۹ دن قبل گوشت، پیاز، لہسن اور انڈا مچھلی سے پرہیز کرے اور روزانہ چھ سو اٹھاون بار مندرجہ ذیل اسمائے گرامی پڑھے۔

ہاہو............ہو ہا............ہو ہوٗ

اور پھر چالیسواں دن یعنی چاند گرہن کا دن ہو تو انھیں کلمات کو الّو کے خون سے تحریر

کرے اور اپنے ساتھ رکھے۔ روزگار مل جائے گا''۔ (طلسماتِ الّو)

طلسماتی تختی:

''پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور ادیبوں کی پگڑی اچھالنے کے لیے ایک طلسماتی تختی تیار کرو۔ صندل کی سوا انچ کی تختی پر یہ نقش ہیرے کی کنی سے کھدوا کے اسے زعفران سے دھو کر ٹریلین کے دھاگے سے گلے میں لٹکا لو اور ہر جمعرات کو جنات والی مسجد میں چراغ جلاؤ پھر بڑے بڑوں کا تمھارے آگے چراغ نہیں جلے گا۔ ٹیڑی شاعری، نثر اور افسانے خوب چلیں گے۔ آڑی ترچھی نثر اور نئی تنقید کا بول بالا رہے گا، میر اور غالب تک کو بہ آسانی نیچا دکھا سکو گے''

(چین و بنگال کا جادو)

بےقراری محبوب کے لیے مجرّب فلیتہ:

''مندرجہ ذیل نقش کو جمعرات کے دن زعفرانی رنگ سے تحریر کر کے فاسفورس سے جلا دیں۔ اس کے بعد اچھی خاصی رقم کارِ خیر کے لیے ہمیں بھیج دیں۔ اس کے بعد کی دعا ہمیں پڑھنا ہے جو کارِ خیر سے فارغ ہو کر پڑھی جا سکتی ہے۔ نقشِ اعظم یہ ہے:

فلاں بن فلاں	یاوحشت / یاوحشت	فلاں بنت فلاں
نام طالب	۴۲۰ یا معشوق ۱۶۸۰	نام مطلوب

(تسخیرِ دل)

ان منتروں اور نقوش کے علاوہ آدمی کو کرسی سے چمٹا دینے کا طریقہ، میز پر چاقو چلانا، کنویں سے دودھ نکالنا، پرائی عورت کو پھانسنے کا لٹکا، شربت میں گھول کر پلا دینے والا مجرب نقش، جن بھوت دور کرنے کا طریقہ، ڈاکنی کو حاضر کرنے کا منتر، نقش برائے روزی، آدمی کو گھوڑا بنانا، رد بلا کا گنڈا، دولت حاصل کرنے کا طریقہ، دل کا ہول دور کرنے کا منتر، وزیر بننے کا گر، محنت سے جی چرانے کا تعویذ، داماد ڈھونڈنے کا ٹوٹکا، کبھی نہ ختم ہونے والا طلسماتی آٹا، لوگوں میں عداوت کرانا، دشمن کو پاگل بنا دینا وغیرہ جیسی سیکڑوں چیزوں کو حاصل کرنے اور انہونی کو ہونی بنانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

احمد جمال پاشا کی ان تمام پیروڈیوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے

نہ صرف بہترین اور شاہکار پیروڈیاں لکھیں بلکہ ''رستم امتحان کے میدان میں''، ''آموختہ خوانی میری'' اور ''مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں'' کے ذریعے اس صنف کو طرزِ نگارش کی تقلید کی چہار دیواری سے نکال کر آزاد فضا میں سانس لینے اور پھلنے پھولنے کا موقع عنایت کیا۔ ''چین و بنگال کا جادو''، ''طلسماتِ الّو'' اور ''تسخیرِ دل'' جیسی تحریفیں لکھ کر اسے نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور نئی منزلوں سے روشناس کرایا۔ پطرس کے کتے، کرشن چندر کے گدھے اور سرشار کے خوجی کی بازآفرینی کے ذریعہ اردو پیروڈی کو بامِ عروج پر پہنچانے میں زبردست رول ادا کیا۔ انھوں نے اپنی پیروڈیوں میں اندازِ بیان کی تقلید کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا اور فن پر اپنی گرفت کمزور نہیں ہونے دی۔ زندگی کا گہرا شعور اور سماجی بصیرت کی واضح جھلکیاں ان تمام تحریفات میں موجود ہیں۔

پاشا صاحب کی پیروڈیوں سے اس خیال کی نفی ہوتی ہے کہ تحریف صرف طرزِ تحریر کی نقالی ہے۔ ان کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پیروڈی کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور اس میں وسعت کی خاص گنجایش موجود ہے۔ شرط صرف فن کار کی ذہانت اور وسیع النظری کی ہے۔ احمد جمال پاشا کی پیروڈیاں اپنے تنوع، پرکشش اندازِ بیان، فن اور مقصد کے خوبصورت امتزاج کی بنا پر اپنے خالق کے نام کو ہمیشہ ممتاز رکھیں گی۔ دنیائے تحریف میں ان کی خوشبو ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔

حوالے:

۱۔ فضل جاوید، کپور بحیثیت پیروڈی نگار، ماہنامہ شگوفہ، کنھیالال کپور نمبر، حیدرآباد، جنوری ۱۹۸۱ء ص ۴۰۔

۲۔ محمد ذاکر (ڈاکٹر) 'آزادی کے بعد ہندستان کا اردو ادب' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۸۱ء ص ۳۱۷۔۳۱۹

۳۔ اختر بستوی۔ احمد جمال پاشا کا فن، ماہنامہ شاعر بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۲۹

خاکہ نگاری

خاکہ یا مرقع کسی شخص کی جیتی جاگتی قلمی تصویر کا نام ہے۔ خاکے کا کمال یہ ہے کہ اسے پڑھتے وقت ایسا محسوس ہو جیسے وہ شخصیت ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے یعنی جگؔر کے لفظوں میں ''وہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں وہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں'' کا سماں ہو۔ مکتوب کو نصف ملاقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خاکہ بھی ایک طرح کی ملاقات ہے یہ ملاقات مختصر بھی ہوسکتی ہے اور طویل بھی لیکن مختصر ملاقات بھی ایسی ہو کہ جس پر صرف ملنے کی تہمت نہ لگائی گئی ہو۔ سوانح کے ذریعہ بھی ہم کسی شخص کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں لیکن خاکہ اس سے بالکل مختلف شے ہے۔ ایک تو یہ کہ سوانح نگاری میں جو حالات بیان کیے جاتے ہیں ان میں بہرحال ایک ترتیب بھی ہوتی ہے اور تفصیل بھی جب کہ خاکے میں واقعات کسی خاص ترتیب سے بیان نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ خاکہ معلومات کا خزانہ نہیں ہوتا بلکہ یہ تو شخصیت کے چہرے سے نقاب اٹھانے کا عمل ہے۔ یہ شکل و شباہت، چال ڈھال، حرکات وسکنات، اخلاق و عادات اور خوبیوں خامیوں سے آگاہ ہونے کا نام ہے۔

خاکے کا موضوع چوں کہ انسان ہوتا ہے اس لیے اس کے ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں پر نگاہ رکھنا ازحد ضروری ہے۔ باطن کی عقدہ کشائی آسان نہیں۔ یہ کام باریک بینی اور دقّت نظری کے بغیر ممکن نہیں اس لیے یہ کہا گیا ہے کہ ''سوانح نگار کے لیے بصارت کافی ہے جب کہ مرقع نگار کے لیے بصیرت شرطِ اولین ہے''۔[۱] پھر یہ بھی کہ انسان خطا اور نسیان سے مرکب ہے۔ وہ جس دنیا میں رہتا ہے وہاں خیر کے ساتھ شر کی کبھی کمی نہیں۔ وہ خیر و شر دونوں کے اثرات قبول کرتا ہے۔ اس کا قلم ایسے آئینے کے مانند ہوتا ہے جو تصویر کو اس کے اصل خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کردیتا ہے۔ خاکہ نگاری کا حسن بے جا عقیدت کے غازے سے بے نیاز ہونا چاہیے ورنہ تصویر کجلا جائے گی۔

عصمت چغتائی کا ''دوزخی'' اردو کے شاہ کار خاکوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک بہن نے اپنے

بھائی پر لکھا لیکن خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی بھر پور روشنی ڈالی۔ خامیوں کا احساس خاکے کے عنوان سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ جس طرح خاکہ نگار صرف خوبیوں کو بیان کرے تو تصویر ادھوری رہ جاتی ہے اسی طرح اگر وہ فقط خامیوں کو اجاگر کرنا چاہے تو اس کی تحریر نثری ہجو کہلائے گی، خاکہ نہیں۔ خاکہ نگاری نہ کسی کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنا ہے اور نہ کسی کو کارٹون بنانا یا اسے ذلیل کرنا ہے۔ اردو میں ایسے خاکوں کی کمی نہیں جن میں کرداروں کا صرف مثبت پہلو ہی سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ کامیاب خاکے ہیں لیکن یہ بات یاد رہے کہ ایسے خاکوں کو کامیاب کہا جاسکتا ہے بھر پور نہیں۔

خاکہ نگار عام طور سے اسی شخصیت پر قلم اٹھاتا ہے جسے اس نے قریب سے دیکھا ہو۔ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتا بلکہ اپنے مشاہدات پر اعتماد کرتا ہے اس لیے خاکہ لکھتے وقت ذاتی تاثرات کے اظہار کی زیادہ گنجایش رہتی ہے لیکن تاثرات کے بیان میں یہ خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ خاکہ تاثراتی مضمون کی صورت اختیار نہ کرے۔ مرقع کشی کے وقت مرقع نگار خود اپنی شخصیت کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا لیکن وہ جس قدر پسِ پردہ رہے بہتر ہے۔ ''وہ خود خاکہ کے کینوس پر اس وقت نظر آئے جب اس کی موجودگی یا ذکر سے مفر کی کوئی اور صورت نہ ہو''۔[2]

ڈاکٹر سید حامد حسین نے لکھا ہے کہ:

''خاکہ اپنے تاثر میں نامکمل رہتا ہے اس لیے اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مذکورہ شخصیت کے ہر پہلو سے نگاہ اٹھائے گا بے جا ہے''۔[3]

یہ خیال بہت حد تک درست ہے۔ تصویریں چھوٹی بڑی ہر طرح کی ہوتی ہیں اگر تصویر چھوٹی ہی سہی مگر جاذبِ نظر اور روشن ہو تو اس سے متاثر ہونا فطری ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد اور وحید الدین سلیم دونوں کے خاکے لکھے۔ پہلا خاکہ طویل ہے اور دوسرا مختصر اور دونوں خاکے موثر اور دل چسپ ہیں۔ دو چار صفحات میں کسی کی زندگی کی تمام تر تفصیلات پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ تصویر تھوڑے ہی وقفے کے لیے نگاہوں کے سامنے آئے مگر جب آئے تو اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ۔

مزاحیہ خاکہ نگاری کو پروان چڑھانے والوں میں ایک اہم نام شوکت تھانوی کا ہے۔ ''شیش محل'' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں ایک سو بارہ افراد کے قلمی چہرے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ خاکے مختصر اور بیش تر مختصر ترین ہیں یہاں تک کہ اقفر موہانی کا خاکہ فقط ایک مصرع۔

آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے دو چار اور آٹھ دس سطور میں کسی کی شخصیت پر کیا روشنی پڑ سکتی ہے وہ بھی ایسی حالت میں جب شخصیت کے ساتھ فن پر بھی اظہارِ خیال کرنا مقصود ہو لہٰذا ان خاکوں کی ادبی حیثیت تذکروں میں تنقیدی عناصر کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی بھی خاکہ ایسا نہیں جسے سیر حاصل کہا جاسکے۔ احمد جمال پاشا نے ''شیش محل'' کی تقلید میں ''آئینے'' کے عنوان سے مختصر خاکوں کا ایک مجموعہ مرتب کرنا شروع کیا تھا جو کتابی صورت میں منظرِ عام پر نہ آسکا البتہ اس کی کچھ قسطیں مختلف اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئی تھیں۔ اس مجموعے میں پچپن خاکے شامل ہیں۔ یہ خاکے بھی مختصر ہیں لیکن ان میں صرف شخصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاکہ نگار کہیں ہچکچاہٹ اور جھجک کا شکار نہیں ہوا بلکہ اس نے ہر شخصیت کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ اس نے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالی ہے۔ ظریفانہ پیرایۂ بیان ہر جگہ موجود ہے۔ ظرافت پیدا کرنے کے لیے مصنف نے کرداروں کو کردار ہی رہنے دیا ہے انھیں کارٹون نہیں بنایا ہے۔ اس کا احساس خود خاکہ نگار کو ہے اس لیے اس نے ''اپنا بیان'' کے عنوان سے مقدمے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب نہ مدلل مداحی ہے اور نہ کسی ادبی معرکے کا سنگِ بنیاد''۔ ہمدردانہ اندازِ نظر کی کارفرمائی ان خاکوں میں موجود ہے۔ احتشام حسین کے خاکے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ترقی پسندوں کے باوا آدم ہر چیز کو مارکسی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں اگر دو مرغے بھی لڑتے ہوں گے تو ان کے اس پس منظر میں آپ کو طبقاتی و سماجی کشمکش کا عکس نظر آجائے گا۔ تحریر میں شگفتگی اس وجہ سے نہیں آنے دیتے کہ انداز بورژوانہ ہو جائے۔ ظاہر باطن یکساں ہے اس لیے شخصیت کے جلالی پہلو پر جمالی پہلو حاوی رہتا ہے۔ مجلس پڑھانے سے لے کر مارکسزم تک ہر قدم پر ترقی پسند ہیں۔ ان کی ذات رحمتی اور بڑی پہلودار ہے جس میں متانت، توازن، ٹھہراو، احتیاط، خلوص، ٹھنڈک، بے دلی، باقاعدگی، کاہلی، وضع داری، مروت، ہمدردی سے لے کر حریت تک سب کچھ مل جائے گا۔...... ان کا امریکہ کا سفرنامہ ''ساحل اور سمندر'' ہے جس میں سمندر کم اور ساحل زیادہ ہے ہمیشہ اپنی بیماری کا تذکرہ کرتے اور تندرست رہتے ہیں''۔

سید احتشام حسین پاشا صاحب کے استاد تھے جن کا وہ ہمیشہ احترام سے نام لیتے رہے لیکن مذکورہ اقتباس میں انھوں نے اشاروں اشاروں میں بہت کچھ کہہ دیا ہے مثلاً ترقی پسندوں

کے باوا آدم کا مجلس پڑھانا، یہ اشارہ بہت معنی خیز ہے آلِ احمد سرور اور نور الحسن ہاشمی بھی پاشا صاحب کے اساتذہ میں تھے ان دونوں کے خاکوں میں بھی یہی اندازِ بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اشرف، اقبال صدیقی، کوثر چاند پوری، مجاز، اختر بستوی، حسن شہیر، اسلوب احمد انصاری، عبدالماجد دریابادی، آنند نارائن ملا، اختر انصاری اور سلامت علی مہدی کے خاکے مختصر ہوتے ہوئے بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ان خاکوں میں جابجا مختصر جملوں میں بڑی بلیغ باتیں کہی گئیں ہیں۔ مثلاً سلامت علی مہدی اقبال کے مردِ مومن کی بگڑی ہوئی تصویر ہیں۔ اقبال صدیقی 'عہدِ نو' کی ایڈیٹری کے ساتھ اپنے آپ کو بھی ایڈٹ کرتے رہتے ہیں۔ حسن شہیر جس سے خوش ہوجاتے ہیں اپنے بعد اس کی عظمت تسلیم کرلیتے ہیں'' لیکن ایسے جملوں سے شخصیت کے کسی پہلو کی ایک دھندلی تصویر ہی سامنے آتی ہے۔ حد سے بڑھا ہوا اختصار ان خاکوں کو کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچنے دیتا۔ ان کی مثال اندھیرے میں جگنو کی سی ہے۔ جگنوؤں کی چمک دیکھنے میں خوشنما ضرور ہوتی ہے مگر اس سے روشنی کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ سید حسن عباس نے ''آئینے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ان کی انفرادیت یہ ہے کہ باوجود یکہ مختصر ہیں مگر مکمل، جامع اور بھرپور ہیں۔ چند سطروں میں شخصیت کی مکمل تصویر پیش کردی گئی ہے۔ کسی طرح کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہر خاکہ اپنے آپ میں مکمل ہے''؎

یہ تنقید نہیں طرفداری ہے ''آئینے'' کا کوئی بھی خاکہ ایسا نہیں ہے جسے پڑھ کر تشنگی کا احساس نہ ہو مثال کے طور پر امیر حسن نورانی کا مکمل خاکہ پیش ہے:

> ''آپ اسلامیہ کالج میں پڑھاتے اور نول کشور میں پڑھتے ہیں۔ دور ہی سے بے حد اکڑے اکڑے بارعب معلوم ہوتے ہیں۔ تقسیم کے بعد نول کشور بک ڈپو میں اردو کے مردے کو زندہ کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ آپ ان حضرات میں سے ہیں جو برابر خاموشی کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں ان کو دور ہی سے دیکھ کر بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی میٹنگ میں جارہے ہیں یا آرہے ہیں۔ آپ کا شماران وضع دار حضرات میں سے ہے جن کے بل بوتے پر شیروانی کا استعمال ابھی متروک نہیں قرار پاسکا۔ شام کو آپ ہمہ دم نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو کے مصداق نظر آتے ہیں''۔

اگر اس خاکے کو مکمل جامع اور بھرپور کہا جاسکے تو پھر ہمیں ان الفاظ کے کوئی نئے معنی تلاش کرنے ہوں گے۔

''آئینے'' کے کچھ خاکے ایسے ہیں جن میں مصنف نے شخصیات سے اپنے روابط کا اظہار کیا ہے لیکن عدم توازن کی وجہ سے اس کی اپنی شخصیت زیرِ قلم شخصیت پر غالب آگئی ہے۔ محی الدین قادری زور، امتیاز علی عرشی، ابوالکلام آزاد، جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، اختر عادل روپ اور سہیل عظیم آبادی کے خاکے اسی زمرے میں آتے ہیں۔

''شیش محل'' اور ''آئینے'' کے خاکوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں مختصر ہیں۔ ان سے شخصیات مکمل طور پر سامنے نہیں آتیں۔ تشنگی باقی رہتی ہے لیکن ''شیش محل'' کے مقابلے میں احمد جمال پاشا نے ترقی کا دوسرا قدم طے کرلیا ہے۔ شوکت تھانوی نے زیادہ زور مزاح پیدا کرنے پر صرف کیا ہے جب کہ پاشا صاحب نے شخصیت کے خدوخال اجاگر کرنے پر توجہ کی ہے۔

شوکت تھانوی کے یہاں اختصار ہے جامعیت نہیں لیکن احمد جمال پاشا صاحب کے یہاں دونوں چیزیں موجود ہیں۔ ''شیش محل'' کے خاکے، خاکے نہیں کچھ اور معلوم ہوتے ہیں لیکن ''آئینے'' کے ساتھ ایسی بات نہیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ تمام خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی ''شیش محل'' مختصر ترین خاکوں کی اردو میں پہلی باضابطہ کوشش ہے اس لیے اس کی اہمیت تاریخی ہے۔ ''آئینے'' اس کی توسیع شدہ اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ نقشِ ثانی میں نقشِ اول کے مقابلے زیادہ جامعیت، پختگی اور توازن ہے۔

احمد جمال پاشا نے بعد میں جو خاکے لکھے ہیں ان میں وہ زیادہ کامیاب ہیں۔ کلیم الدین احمد، عابد سہیل، آغا سہیل، حسن عابد، حسن کمال، سید مسیح الحسن رضوی، غیاث احمد گدی، حیات اللہ انصاری، رام لعل، اطہر پرویز، محمد حسن قدوائی، قمر رئیس، خواجہ احمد عباس، رتن سنگھ اور اقبال مجید کے مرقعوں میں زندگی کی لہر موجود ہے۔ ان میں سے بیش تر شخصیات ایسی ہیں جن کے ساتھ خاکہ نگار نے اپنی زندگی کے اوقات گزارے ہیں اور انھیں ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ ایسی شخصیتوں میں زیادہ تر پاشا صاحب کے رفیق کا درجہ رکھتی ہیں اس لیے ان کے خاکوں میں طرزِ تحریر زیادہ دلآویز ہے لیکن جن سے ان کے نیازمندانہ تعلقات رہے ہیں ان کے بیان میں بھی قلندرانہ شان موجود ہے۔ مثال کے طور پر کلیم الدین احمد، محمد حسن قدوائی اور حیات اللہ انصاری کے خاکے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ اپنی تحریروں میں وہ جتنے بے باک تھے ذاتی زندگی میں اسی قدر گم سم اور خود کو لیے دیے رہتے تھے۔ وہ کھلتے بھی تھے تو خاص لوگوں سے اور خاص موقعوں

پر۔ اپنی شخصیت کے گرد انھوں نے خاموشی کا پہرہ بیٹھا رکھا تھا۔ پاشا صاحب نے ان کا جو مرقع پیش کیا ہے اس میں مختلف واقعات کی مدد سے پہلے تو اس ادبی ہلچل کو اجاگر کیا ہے جو کلیم صاحب کی تحریروں کی بدولت پیدا ہوئی تھی اور پھر ان کے حلیے، وضع قطع اور افتادِ طبع کا بیان نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ حلیہ ملاحظہ ہو:

''میں نے پہلی بار بہت غور سے انھیں دیکھا وہ مجھے ایک نہایت سرخ و سپید تندرست قسم کے بزرگ لگے۔ بوٹا سا قد، لمبان کے مقابلے میں چوڑان اطمینان بخش، نہایت سنجیدہ متین، خاموش، لیے دیے، چہرے پر وقار اور آسودگی۔ خاموش بیٹھتے تو چہرہ تقریباً چوکور مگر بھرا بھرا، مسکراتے یا بات کرتے تو منھ گول ہو جاتا۔ غرض عام انسانی چہروں سے خاصا مختلف''۵؎

کلیم صاحب کے لکھنے پڑھنے کا طریقہ ان کی باقاعدہ زندگی، مزاج کی مروت اور نرمی، اپنے فرائض کا بخوبی احساس، سلوک کرنے پر ہمیشہ تیار رہنا، غیبت سے اجتناب، ساتھ ہی مردم شناس نہ ہونا، تنہائی میں خوب باتیں کرنا، جنسی موضوعات اور اسکینڈلز سے دل چسپی۔ ان سب بیانات نے کلیم صاحب کو اپنے حقیقی رنگ و روپ میں ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

محمد حسن قدوائی ''قومی آواز'' میں ملازم تھے۔ شخصیت بہت محترم تھی اس لیے ہر شخص ان کا ادب و احترام کرتا۔ پاشا صاحب کو اخبار میں کام کرنے کا گر قدوائی صاحب نے ہی سکھایا۔ پاشا صاحب نے بھی ان کا بہت جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے۔ ان کی شخصیت کا جلال و جمال، معصومیت، شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی، ایمانداری اور جفاکشی، بے خوفی، انکساری اور غضب کا اعتماد ان تمام اوصاف سے متصف محمد حسن قدوائی کا صاف شفاف، دھلا، دھلایا اور نکھرا ہوا پیکر صفحۂ قرطاس پر ہنستا مسکراتا نظر آتا ہے۔ پاشا صاحب نے شخصیت کی نقاب کشائی میں جسارت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن یہ جسارت ادب کے دائرے میں ہے۔ قدوائی صاحب کی زندگی کے جن گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بھرپور ہے۔ یہ زندہ اور روشن تصویر دیکھیے:

''محمد حسن قدوائی صاحب صحافت کے جگت استاد تھے۔ ترجمہ نہیں تخلیق کرتے۔ لفظ پہ لفظ بٹھاتے، الفاظ کے نگینے جڑتے، ترجمہ کی تیاری اس طرح کرتے جیسے لوگ عبادت کے لیے طہارت کرتے ہیں۔ سب سے پہلے برآمدے میں وضو کرتے، ہاتھوں میں پانی لیا، کچھ سوچنے لگے، پانی بہہ گیا۔ چھپا کا جو مارا تو

منھ پر خالی (ہاتھ) پڑے۔ وضو کر کے اٹھے تو کسی نے ٹوک دیا۔ باتیں کرنے میں بھول گئے اور بیڑی سلگائی۔ اچانک خیال آ گیا تو مخاطب پر لاحول بات ادھوری پھر وضو شروع ہو گیا۔ سلام پھیرتے تو دفتر کی جانب اس مشکوک انداز میں دیکھتے جس میں حرام خوری کا شکوہ ہوتا۔ دعا ایسی گڑگڑا کر مانگتے گویا شعبۂ ادارت کے لیے خدا سے ترجمہ کی صلاحیت مانگ رہے ہوں۔ مصلیٰ اٹھاتے اور کرسیِ صدارت پر جم جاتے، ٹیلی پرنٹر پر کچھ اس طرح ہاتھ پھیرتے جیسے گائے دوہنے سے پہلے گوالا گائے کو چمکارتا ہے کہ بچک نہ جائے۔ پھر کاغذی طومار میں غرق ہو جاتے''۶؎

''حیات اللہ انصاری'' احمد جمال پاشا کا متنازعہ خاکہ ہے اس کی اشاعت پر خصوصاً لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں عرصہ تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ حیات صاحب بڑی افضل شخصیت تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اردو کے سپاہی، مجاہدِ آزادی اور کانگریسی لیڈر کی حیثیت سے وہ مشہور تھے۔ وہ عرصہ تک قومی آواز کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ انھوں نے ہی پاشا صاحب کو اخبار کے شعبۂ ادارت میں شامل کیا تھا۔ پاشا صاحب نے ان کا جو خاکہ لکھا ہے اس میں جہاں ان کی خوبیاں دکھائی ہیں وہاں شخصیت کے کمزور پہلوؤں کو بیان کرنے میں بھی مروت سے کام نہیں لیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ دکھائی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احمد جمال پاشا نے یہ خاکہ حیات اللہ انصاری کی مخالفت میں لکھا ہے اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں یا انھوں نے فقط آئینہ دکھایا ہے۔ اس خاکے کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ خاکہ نہیں نری مخالفت اور تنقیص ہے۔ پاشا صاحب نے جن واقعات کے پس منظر میں جو باتیں کہی ہیں اگر معترضین انھیں غلط ثابت کر دیں تو ایک بات ہوگی ورنہ صرف زبانی اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا۔ احمد جمال پاشا نے حیات اللہ انصاری کو جیسا دیکھا ویسا پیش کر دیا۔ خاکہ نگاری اگر صحیح تصویر کشی کا نام ہے تو یہاں احمد جمال پاشا کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

احمد جمال پاشا نے اپنے قریبی دوستوں کے جو مرقعے قلم بند کیے ہیں وہ زیادہ تر موثر اور دل پذیر ہیں۔ وہ ماضی کا ذکر کرتے ہیں تو اسے حال بنا دیتے ہیں۔ یادِ ماضی ان کے لیے عذاب نہیں بلکہ خوش گوار کافی خوش گوار ہے۔ آغا سہیل، حسن عابد، حسن کمال اور قمر رئیس کے خاکوں میں خوش گوار یادوں کے سہارے تصویروں میں رنگ بھرے گئے ہیں۔ یہ تصویریں بولتی ہوئی ہیں۔ مرقع نگار نے جو نقشا کھینچا ہے اس میں کرداروں کے ساتھ وہ خود بھی برابر کا شریک ہے۔ ایک طرف وہ کرداروں کے ماضی سے ہمیں

واقف کراتا ہے تو دوسری طرف حال کے آئینے میں بھی ان کی ادائیں دکھاتا ہے۔ اس عمل میں وہ سوانح نگار نہیں بنتا بلکہ خاکہ نگار ہی رہتا ہے اس لیے اس کی توجہ شخصیات کی عقدہ کشائی سے غافل نہیں ہوتی۔ دوستوں کی خوشیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں، غم اور محرومی واقعات کے پردے میں کرداروں کی فطرت کا بے لاگ تجزیہ یہی ان خاکوں کی خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعلیم اور رام لعل کے مرقعے بھی بہت خوبصورت ہیں۔ عبدالعلیم اردو ادب کی انتہائی معزز شخصیت تھے۔ پاشا صاحب نے ان کے مرقعے میں چند پہلوؤں کو دکھانے پر اکتفا کیا ہے لیکن اس سے جو شخصیت ابھرتی ہے وہ نہایت مہذّب، ممتاز اور نستعلیق ہے۔ علیم صاحب کی ناک اور کان بات بات پر سرخ ہو جایا کرتے تھے اس لیے مرقع نگار نے ان اعضاء کو علیم صاحب کا ''مزاجی بیرومیٹر'' قرار دیا ہے اور ان کے علم و فضل، نیکیوں اور سربلندیوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ''عہد آفریں دور کی انتہائی شاندار شخصیت اور اردو ادب کے مغلِ اعظم'' جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ رام لعل کے خاکے میں ان کی دوست نوازی، نظم وضبط، رکھ رکھاو، سنجیدگی و توازن، خلوص، اپنی اہمیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ان کی شانِ بے نیازی کی کیفیت کو ابھارا گیا ہے۔ شخصیت کا یہ پہلو ملاحظہ فرمائیے:

> ''رام لعل صاحب ترقی پسند ہیں مگر جنگجو قسم کے ہرگز نہیں۔ وہ ایک خاموش اور گمنام سپاہی ہیں جس نے نہ کبھی اپنی قربانیوں کا صلہ طلب کیا نہ کبھی اچھلنے اور اچھالے جانے کی آرزو میں دبلے ہونے کی کوشش کی۔ افسانہ نگاروں کی قوم بڑی کافر ہوتی ہے وہ آپ کو نہ صرف دنیا کا ایسا اہم ترین آفاقی افسانہ نگار سمجھتی ہے جسے بدنصیب قوم ابھی تک پہچان نہ سکی ہے اور ساتھ ہی اپنے معاصر یا ہم سفر افسانہ نگار کو سرے سے افسانہ نگار ہی نہیں مانتی مگر ممکن نہیں کہ رام لعل صاحب سے ملاقات ہو اور وہ یہ نہ بتائیں کہ فلاں اور فلاں نے ادھر بہت اچھے افسانے لکھے ہیں......ان کا بس چلے تو شاید وہ پوری دنیا کو افسانہ نگار بنادیں''۹

مختصر یہ کہ احمد جمال پاشا نے ''آئینے'' کے خاکوں کے ذریعے خاکہ نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان کرانے کی کوشش کی۔ چند سطروں میں چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کے عمل سے گزرے اور شوکت تھانوی کے ''شیش محل'' کی روایت کو آگے بڑھایا۔ آگے چل کر انھوں نے نسبتاً طویل اور کامیاب خاکے قلم بند کیے چوں کہ ان کے خاکوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا اس لیے مرقع نگار کی حیثیت سے ابھی وہ معروف نہیں

ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ ان خاکوں کی اشاعت کے بعد ان کے فن کا ایک نیا پہلو اردو دنیا کے سامنے آئے گا اور ظرافت نگار کے ساتھ ساتھ ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی انھیں تسلیم کیا جائے گا۔

حواشی

(۱) رشید احمد صدیقی، شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔ نیشنل بک ڈپو چار کمان حیدر آباد۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء ص ۲۲۰۔

(۲) گنجے فرشتے۔ سعادت حسن منٹو۔ ساقی بک ڈپو دہلی۔ ۱۹۸۳ء ص ۳۱۲

(۳) اردو ادب میں خاکہ نگاری ڈاکٹر صابرہ سعید۔ مکتبہ شعر وحکمت۔ حیدر آباد۔ ۱۹۷۸ء ص ۱۷

(۴) نثر اور اندازِ نثر۔ ڈاکٹر سید حامد حسین۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۵۶

(۵) احمد جمال پاشا کی خاکہ نگاری۔ سید حسن عباس۔ ''نیا دور'' لکھنؤ یادِ رفتگاں نمبر حصہ اوّل اپریل ستمبر ۱۹۸۸ء ص ۲۱۰، ۲۱۲

(۶) کلیم الدین احمد۔ احمد جمال پاشا سہ ماہی ''کاوش'' گوپال گنج۔ جون۔ اگست ۲۰۰۴ء ص ۱۳۷

(۷) استاد محمد حسن قدوائی مرحوم۔ احمد جمال پاشا ''معلّمِ اردو'' لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۸۹ء ص ۳۲۔۳۳

(۸) پاشا، میرے محسن میرے آقا، اظہار احمد، ''معلّمِ اردو'' لکھنؤ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۱۰۰

(۹) رام لعل فن اور شخصیت۔ مرتبہ نریندر ناتھ سوز۔ سیمانت پرکاش نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۱۴۴۔۱۴۶

کالم نگاری

صحافت اور کالم میں بڑا نازک رشتہ ہے۔ اخباری صحافت کی بنیاد ہنگامی واقعات و حادثات، مقامی خبروں اور قومی و بین الاقوامی مسائل پر استوار ہوتی ہے۔ ایک اچھے اخبار سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو ملک اور بیرونِ ملک کی تازہ ترین اور صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ وہ غیر جانب دار رہتے ہوئے اہم مسائل کا تجزیہ کرے تاکہ صحیح سمت کی نشاندہی ممکن ہو سکے۔ کالم جو اخبار کا اہم حصہ ہوتا ہے اس پر بھی صحافت کی اس روش کا براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ کالم سنجیدہ بھی ہوسکتا ہے اور مزاحیہ بھی۔

انسانی زندگی تضادات سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے معاشرے میں روزانہ سیکڑوں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جنھیں ہم پسند نہیں کرتے یا جو مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ یہ واقعات بیش تر وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بے ڈھنگا واقعہ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے جس کے اثرات دور رس ہوتے ہیں۔ اب یہ مزاحیہ کالم نویس کی افتادِ طبع اور صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ ان میں سے کس واقعے کا انتخاب کرتا ہے۔ کالم نگار نے چاہے جو موضوع منتخب کیا ہو لیکن اسے تحریر کا جامہ پہناتے وقت وہ اپنے قارئین کی پسند و ناپسند کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ اس کا اندازِ بیان دل چسپ ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں کام کی باتیں کہتا ہے۔ ہماری اور ہمارے معاشرے کی کمزوریوں اور ناہمواریوں کی جانب اشارے کرتا ہے۔ اخبار کے قاری ہر سطح کے ہوتے ہیں۔ اسے جوان بھی پڑھتے ہیں اور بوڑھے بھی، گھر میں بیوی پڑھتی ہے تو ماں بہنیں بھی۔ اسے کالج اور یونیورسٹی کی سطح کے لوگ پڑھتے ہیں تو کم پڑھے لکھے بھی۔ اس لیے کالم نگار کی ذمّے داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اسے سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اس کے پاس وقت اور جگہ دونوں کی کمی ہوتی ہے۔ اسے کم وقت میں مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے کالم میں فلسفیانہ تاویلیں نہیں پیش کرسکتا۔ وہ ایک ایسا مسافر ہے جس کے ایک طرف صحافت کی وادی ہے تو دوسری طرف دنیاے ادب۔ کالم نگار کو ان دونوں کے درمیان سے گزرنا ہوتا ہے۔ البتہ اس کا جھکاو ادب کی طرف ضرور ہوتا ہے۔ وہ دنیاے ادب میں داخل ہوتا ہے لیکن اس کے اندر دور تک نہیں جاتا۔ ادب اور صحافت دو علاحدہ

چیزیں ہیں۔ ان کے درمیان توازن قائم رکھنا دشوار ہے اور یہی دشوار کام ایک کالم نگار کرتا ہے۔ مزاحیہ کالم نگاری کے بارے میں احمد جمال پاشا کی یہ راے بہت مناسب ہے کہ:

''اچھا مزاحیہ کالم وہی سمجھا جاتا ہے جو بین بین ہو۔ یعنی نہ اتنا ادبی ہو کہ عام پڑھنے والے کے سر سے گزر جائے، نہ اتنا پست ہو کہ بازاری ہو جائے''[1]

ادبی کالم اخباری خبروں کی طرح نہیں ہوتا کہ جن کی تازگی دوسرے روز ہی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ کوئی ایسی تحریر جس سے مٹّھی بھر لوگ ہی حظ اٹھا سکیں، وہ کالم کے علاوہ سب کچھ ہوسکتی ہے۔ کالم نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے قارئین کو اچھے اور برے میں تمیز کرنا سکھائے اور ان کی ذہنی تربیت میں اس طرح معاون ثابت ہو کہ وہ ایک بہتر انسان اور اچھے شہری بننے کے لائق ہوسکیں۔ سماج میں اگر کسی سطح پر ناانصافی ہو رہی ہے، حق اور انصاف کا خون ہو رہا ہے، بدنظمی اور بدانتظامی کی شکایت عام ہے تو اس کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنا کالم نگار کی بھی ذمّے داری ہے لیکن اسے ناصح یا واعظ کا رول ادا کرنا نہیں ہوتا۔ اسے تو قاری کو اپنی باتوں سے محظوظ کرتے ہوئے اس کی قوتِ فکر کو بیدار کرنا ہے۔ کالم نگار اگر کسی ہنگامی واقعے کا بیان بھی کرے تو اس میں اتنی خوبی ضرور ہونی چاہیے کہ قاری اسے پڑھ کر بقول فکر تونسوی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ:

''میں جس سماج میں سانس لے رہا ہوں، یہ سانس اس کی پھانس بنتے جا رہے ہیں اور ایسے سماج میں اگر تغیر نہ لایا گیا تو ہم تمام شہری شہری نہیں کہلائیں گے، جنگلی کہلائیں گے''[2]

کالم کا شمار ادبیات میں ہوسکتا ہے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ کالم نگار کا طرزِ عمل اگر مناسب ہے اور اس کی فکر کا انداز عامیانہ نہیں تو اس کے کالموں کا شمار یقیناً ادب میں ہوگا۔ ورنہ ہم ان تحریروں کو ایسے خانے میں رکھیں گے جن پر صحافتی رنگ غالب رہتا ہے۔

اردو میں کالم نگاری کی روایت تقریباً ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے۔ ''اودھ پنچ'' سے اس کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ منشی سجاد حسین کے دو مزاحیہ کالموں ''لوکل'' اور ''موافقتِ زمانہ'' نے اپنے وقت میں بڑی شہرت پائی۔ ''اودھ پنچ'' کی تقلید میں بہت سے اخباروں میں مزاحیہ کالم نگاری شروع ہوئی۔ ''الہلال'' اور ''زمیندار'' جیسے اخبارات میں ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے مولانا آزاد اور ظفر علی خاں نے کالم لکھے۔ عبدالمجید سالک نے بھی اس عنوان سے طبع آزمائی کی۔ آزادی سے پہلے اور اس کے کچھ بعد کے کالم نگاروں میں چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی، قاضی عبدالغفار،

مجید لاہوری، حاجی لق لق اور دیوان سنگھ مفتون کے نام اہم ہیں۔ اس کے بعد کے مشہور کالم نگاروں میں کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، ابنِ انشا، تخلص بھوپالی، شاہد صدیقی، ابراہیم جلیس، خواجہ احمد عباس، یوسف ناظم ،احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین کے نام آتے ہیں۔ دورِ حاضر میں پاکستان میں کالم نگاری کی روایت خوب پھلی پھولی۔ وہاں احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ، مختار زمن، نصر اللہ خاں، منّو بھائی، محسن بھوپالی، عطاء الحق قاسمی وغیرہ نے اچھے کالم لکھے لیکن ہندستان میں خواجہ احمد عباس اور فکر تونسوی کے انتقال کے بعد مجتبیٰ حسین اور نصرت ظہیر کے علاوہ اس میدان میں کوئی دوسرا قابلِ ذکر نام نظر نہیں آتا۔

احمد جمال پاشا ''قومی آواز'' میں ملازمت کے دوران اس کا مزاحیہ کالم ''گلوریاں'' لکھتے رہے۔ قومی آواز کے علاوہ ہندی روزنامہ ''نوجیون'' میں ''پھلجھڑی'' کے عنوان سے ان کا کالم شائع ہوتا تھا۔ ''پھلجھڑی'' میں بیش تر چیزیں وہی ہیں جو پہلے ''گلوریاں'' کے تحت چھپ چکی ہیں۔ احمد جمال پاشا نے اپنی زندگی میں تقریباً دو سوصفحات پر مشتمل اپنے کالموں کو ''گلوریاں'' کے نام سے ہی مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے چوراسی کالموں کی فہرست تیار کی جس کا عنوان ''خاصدان'' رکھا۔ وہ اس کا مختصر مقدمہ بھی ''برگِ سبز'' کے عنوان سے لکھ چکے تھے لیکن وہ اپنی بنائی فہرست سے مطمئن نہیں تھے اور کچھ کالموں پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی ناگہانی موت نے انھیں اس کا موقع نہیں دیا۔ ان کے کاغذات میں راقم الحروف کو کتاب کا جو مقدمہ دستیاب ہوا ہے، قارئین کی دل چسپی کے لیے اسے درج کیا جاتا ہے:

''خاصدان حاضر ہے۔ گلوریاں نوش فرمائیے۔ اس میں مزاح کی پھلجھڑی بھی آپ کو روشن نظر آئے گی اور فکر کے تازیانے بھی آپ محسوس کریں گے۔ تکلّف نہ کیجیے۔ منہہ نہ کٹے گا۔ کتھا چونا برابر کا لگایا ہے۔ پھر بھی اگر چونا لگ جائے تو مجبوری ہے لیکن پان کھانے والوں کا منہہ ذرا کم ہی کٹتا ہے۔

پان کھانے کے بعد اگر طبیعت بدمزا ہو جائے تو میرا ذمّہ، اور اگر مزے پر آجائے تو آپ کا اقبال۔ تحفۂ برگِ سبز کے علاوہ درویش کے پاس کیا ہے؟

خیر صاحب! آپ خاصدان سنبھالیے اور بندے کو اجازت دیجیے۔

آداب عرض

احمد جمال پاشا''

احمد جمال پاشا کے کالموں کی مجموعی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے جن کی سختی سے چھان پھٹک

کے بعد تقریباً پچاس ایسے نکلتے ہیں جنھیں فنی اعتبار سے کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ ''جعلی راشن کارڈ''، ''ماڈرن آرٹ''، ''بجلی کی آنکھ مچولی''، ''گدھے کی ڈائرکٹری''، ''مردانہ دوپٹہ''، ''نئے کھانے''، ''گرانی اور ارزانی''، ''صاحب زادے بلند اقبال کو اسکول میں پڑھایا''، ''لارس اسکیم''، ''انسانی بجلی گھر''، ''دہی مچھلی''، ''الکشن اور سلکشن''، ''تین نمک''، ''چوہے پکڑنے کے پھندے''، ''ایک سنسنی خیز چوری''، ''ہماری عادتیں ہمارے جذبات''، ''انتخابی نشانات''، ''احمقوں کی جنّت''، ''کوڑے کا پہاڑ''، ''جیبی ٹیلی فون''، ''امتحان اور امتحان کے بعد''، ''تخفیف کے لیے اضافہ''، ''پتنگ کا موسم''، ''رکاب گنج کا پُل''، ''کچھ نئے ٹیکس''، ''ہماری گلی''، ''باڑھ میں باڑھ''، ''لیٹ گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل''، ''نئی یونیورسٹی''، ''پٹائی کا موسم''، ''لٹکے کا پٹکا''، ''جیب کترے کی کہانی''، ''پیسے دو نقل کرو''، ''سائڈ سے چلیے''، ''مسٹر ڈاکو ایم۔ اے ایم۔ بی۔ بی ایس''، ''صنفِ مضبوط''، ''نمکین شربات''، ''قیمتوں کی اڑان''، ''خدا اور کمپنی پر مقدمہ''، ''ٹکنی کلر چٹ فنڈ ان لمیٹڈ'' وغیرہ احمد جمال پاشا کے عمدہ کالم ہیں۔ پاشا صاحب نے متنوع موضوعات پر مختصر الفاظ میں شوخ تبصرے کیے ہیں۔ ان کالموں میں طنز کے مقابلے مزاح کا پہلو زیادہ ہے۔ اس مزاح میں پھکڑ پن اور ابتذال نہیں بلکہ ایک رکھ رکھاو کی کیفیت ہے۔

احمد جمال پاشا کے کالم عموماً مقامی، ملکی اور غیر ملکی خبروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے صاف پتا چلتا ہے کہ کالم نگار کی نگاہیں اخبار پڑھتے پڑھتے اچانک کسی ایسی خبر پر ٹھٹھک گئی ہیں جو مضحکہ خیز ہے۔ اس خبر پر اس نے اپنا ردِ عمل مزاحیہ پیرایے میں ظاہر کیا ہے۔ پاشا صاحب کالم لکھتے وقت کسی خبر کی سرخی کو سامنے رکھ کر اس پر اپنی جانب سے کئی ظریفانہ سرخیوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ اس عمل میں وہ کامیاب ضرور ہوئے ہیں لیکن یہ کامیابی اس وقت ناکامی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب لہجے اور طرزِ بیان میں مسلسل یکسانیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ پاشا صاحب جہاں سرخی پر سرخیاں جمانے کے چکّر میں نہیں پڑتے اور فقط تبصرے پر اکتفا کرتے ہیں وہاں وہ نسبتاً زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ مثلاً اجین یونیورسٹی نے ایک بار یہ فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی کنونشن کے موقعے پر طلبہ گاون کے بجاے دوپٹے کا استعمال کریں گے۔ اس پر ایک پروفیسر نے یہ پیشن گوئی کی کہ وہ دن بھی آنے والا ہے جب طلبہ ڈگری لینے کی خاطر بھبھوت مل کر گیروا لنگوٹ باندھے، کشکول لیے، کھٹ کھٹ کرتے، کڑا بجاتے اور دوپٹہ لہراتے آیا کریں گے۔ یونیورسٹی کے اس فیصلے اور پروفیسر موصوف کی پیشن گوئی پر احمد جمال پاشا کا یہ تبصرہ دیکھیے:

''نہ ہمیں اس فیصلے پر تعجب ہوا اور نہ پیشن گوئی پر۔ کیوں کہ پڑھائی، فیس اور امتحان

کے خلاف چلنے والی طلبہ کی ہمہ گیر تحریکوں کے پیش نظر یہ بھی پیشن گوئی کی جاسکتی ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب یونیورسیٹیاں اصولی طور پر طلبہ کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیں گی کہ طلبہ کو امتحان لیے بغیر ڈگریاں دی جائیں۔ اس کے بعد اس بے روزگاری کے دور میں بلاعلم کی ڈگریوں سے زیادہ ان کا کشکول اور دوپٹہ ہی کام آیا کرے گا۔ آخر پراچین بھارت میں بھی تو ''بھکشا سے شکشا پراپت'' ہوتی تھی۔ اگر گردشِ ایام کے ساتھ لوٹنے کے بعد ہم ''شکشا سے بھکشا'' کی جانب لوٹ جائیں تو طلبہ کے بہت سے مسائل کے ساتھ بے روزگاری جیسا قومی مسئلہ بھی خود بخود حل ہوجائے گا''۔[۳۳] (مردانہ دوپٹہ)

پاشا صاحب کے وہ کالم جو کسی اخباری خبر سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کی اپنی ذہانت وذکاوت کا نتیجہ ہیں، زیادہ بہتر ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ: ''کالم نگار جب تک اپنے اور زمانے کے غم کو انگیز نہیں کرلیتا تب تک سچی اور اچھی کالم نگاری نہیں کرسکتا۔ کالم نگاری کے لیے مزاحیہ کالم نگار کا صرف ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے''[۳۴] احمد جمال پاشا کے کالموں میں یہ خصوصیت موجود ہے۔ عوامی مسائل پر ان کی نگاہ ہے۔ یہ مسائل انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ بجلی کی قلت، مہنگائی، خالص اشیا کا نہ ملنا، چوربازاری، اسمگلنگ، اسپتالوں کا حالِ زار، بڑھتا ہوا کرپشن، پولس کی دھاندلی، گاڑیوں کا وقت پر نہ چلنا، رشوت خوری، شہروں میں ٹریفک کا مسئلہ، میونسپلٹی اور کارپوریشن حکام کی بے حسی، ٹیکس میں اضافے کا رجحان......ان تمام موضوعات پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ طنز و مزاح کی آمیزش انھیں واعظِ خشک بننے سے روکتی ہے اور یہ آمیزش ان کی باتوں کو گوارا بنادیتی ہے۔ ان کالموں میں نہ کہیں برہمی ہے، نہ جھلاہٹ اور نہ تلخی۔ بس ہلکا پھلکا انداز، رواں تبصرہ اور زیرِ لب تبسم۔ اس تبسم اور مسکراہٹ کی آڑ میں مقصد کا اظہار ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر شہروں میں بڑھتی ہوئی گندگی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر کالم نگار کا یہ ردِ عمل ملاحظہ ہو:

''اگر گندگی کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جب کہیں بھی صفائی نظر آنے پر نوٹس مل جایا کرے گا کہ آپ کے یہاں گندگی کیوں نہیں ہے۔ وجہ بتایئے کہ کیوں نہ آپ کا چالان کردیا جائے......سڑک یا گلی کے کنارے کارپوریشن کے کوڑے کے انبار کا مصرف تو سمجھ میں آتا ہے کہ ان سے نالیاں بند

ہوجاتی ہیں اور یہ امید رہتی ہے کہ نالی کے بہاو سے کوڑا بہہ جائے تو اٹھانے کی زحمت کیوں کی جائے لیکن بیچ سڑک پر کوڑا جمع کرنے کی حکمتِ عملی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہت ممکن ہے کہ بیچ سڑک پر کوڑے کا ڈھیر اس توقع پر لگایا جارہا ہو کہ تیز بارش اسے بہالے جائے۔ کوڑے کے ڈھیر بلکہ پہاڑ اگر کارپوریشن اسی طرح لگاتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب کسی سڑک یا گلی سے گزرنے کے لیے نٹ ہونا اور جمناسٹک کی ٹریننگ لینا ضروری ہوگا''۔ (کوڑے کا پہاڑ)

ایک اور مثال پیش ہے:

''گذشتہ الکشن میں جن صاحب کا نشان جھونپڑی تھا وہ شہر کے ایک عالی شان محل میں رہتے ہیں......اسی طرح جس امیدوار کا نشان چراغ تھا وہ بجلی کے بلب کا کاروبار کرتے تھے اور ان کے مخالفین نعرے لگاتے ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے......ایک صاحب کا نشان ہاتھ تھا وہ ایک ایک ووٹر کا ہاتھ پکڑ کے کہتے 'ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے، ہاتھ دکھانے کا ایک موقع مجھ کو بھی دیجیے اس ہاتھ کو نہ بھولیے گا......ہمارا مشورہ ہے کہ......اگر امیدوار کاروبار کے اعتبار سے ناپ تول کا عادی ہے تو اس کو ''ترازو'' دی جائے تا کہ اتنے دن وہ کم از کم ڈنڈی نہ مار سکے......اگر امیدوار کی دولت اور حیثیت مشکوک ہو تو اس کا نشان آئینہ ہونا چاہیے......جو امیدوار کامیابی کے لیے الکشن کے موقع پر فوج داری اور فساد کراتا ہو اس کا نشان ''لنگوٹ'' ہونا چاہیے''۔ (انتخابی نشانات)

ہر سچا فن کار بہتر معاشرے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ جس ماحول میں سانس لے رہا ہو وہ ہر طرح کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک ہو۔ کالم نگار بھی ایک فن کار ہے لہٰذا اس کے دل میں بھی صاف ستھرے اور پاک صاف سماج کی تمنا انگڑائیاں لیتی ہے اس لیے وہ کہیں ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے پاس ایک تیسری آنکھ بھی ہوتی ہے جس سے وہ زمانے پر نظر رکھتا ہے۔ ایمانداری کے پردے میں اگر بے ایمانی فروغ پارہی ہو، ہمدردی اور ایثار کے نام پر اگر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جارہی ہو، امن کے پجاری آستینوں میں سانپ چھپائے پھرتے ہوں، انقلاب کا نعرہ لگا کر اپنا بینک بیلنس بڑھایا جارہا ہو تو کالم نگار کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ فریب، ریاکاری اور مکاری کے پردے کو چاک کردے اور ان دوست نما دشمنوں کو عوام

کے کٹہرے میں لا کھڑا کرے۔ احمد جمال پاشا نے اپنے کالموں کے ذریعہ یہ فرض انجام دیا ہے۔ ''وہ ان عناصر کی گرفت بہت جلد کر لیتے ہیں جو اخلاقی قدروں اور صالح معاشرے کی جڑوں میں چونے کا پانی ڈال کر سبزہ زار بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا قلم پگ ڈنڈی سے ہوتا ہوا شاہراہ پر آتا ہے جہاں وہ بھیڑ بھاڑ سے نظریں بچا کر ایک خاص ادا سے طنز و ظرافت کی شمع لیے آگے بڑھتے ہیں جس سے آس پاس کی گندگی صاف نظر آنے لگتی ہے وہی گندگی اور غلاظت پراگندہ حالت میں ہر جگہ نظر آتی ہے جس کا تعفن ذہنوں کو مفلوج کرتا رہتا ہے''۵؎ ''نئے کھانے''، ''چوہے پکڑنے کے پھندے''، ''سیکولرزم کی شدھی''، ''گر ہمیں مکتب وہمیں ملا''، ''چراغ تلے اندھیرا'' اور ''جیب کترے کی کہانی'' جیسے کالم میں احمد جمال پاشا کا یہی روپ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''جب میں کسی گرہ کٹ کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے روپ میں کوئی سیٹھ ساہوکار، کوئی نیتا، کوئی افسر یا کوئی دوسرا بہت مہان چہرا نظر آتا ہے۔ اس کا شان دار ڈرائنگ روم دکھائی دیتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے سماج کا ہر مال دار آدمی گرہ کٹ ہے اور ہر گرہ کٹ مجھے کوئی بہت ہی باعزت سفید پوش معلوم ہوتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیا ہم سب گرہ کٹ ہی ہیں''۔

(جیب کترے کی کہانی)

عوام کی گرہ کن کن طریقوں سے کاٹی جاتی ہے اس کی ایک عبرت ناک مثال گلیوں گلیوں میں کھلنے والے پرائیوٹ پبلک اسکول بھی ہیں۔ فارم کی خریداری، داخلہ ٹسٹ، داخلہ فیس اور اس کے بعد پکنک، سیر و تفریح، ثقافتی پروگرام اور دوپہر کے ناشتے کے نام پر رقم اینٹھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پاشا صاحب ایک کالم میں اس کی کامیاب جھلک دکھاتے ہیں:

''رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ بچے کے اسکول نے ہمارا بجٹ فیل کر دیا۔ مقروض کر دیا اور ہمارا حلیہ بگاڑ دیا۔ بچے کی تعلیمی رفتار میں اسکول جا کر کوئی خاص فرق نہ آیا تھا سوائے تھرک تھرک کر اور ناچ ناچ کے دو تین نظمیں سنا دینے کے باقی ہر چیز میں وہ بالکل کورے تھے۔ اردو، ہندی، انگریزی، حساب سب میں ایک دم بالکل صاف مگر ہمیں اطمینان ہے کہ بلڈنگ فنڈ میں چندہ دے دینے کے بعد سالانہ امتحان میں ہمارا بچہ پاس ہوجائے گا اور اگر ہم نے فراخ دلی سے کام لیتے

ہوئے لمبا چندہ دے دیا تو فرسٹ تک آسکتا ہے۔ بیگم صاحبہ کا کہنا ہے کہ اگر آپ بچے کے اسکول کی کتابیں، کاپیاں، یونی فارم وغیرہ دلانے کے بجائے اگر اس کا پیسہ بھی اسکول کی ہیڈ مسٹریس کی خدمت میں پیش کر دیتے تو ہمارا ہونہار بچہ سارے اسکول میں فرسٹ آسکتا تھا''۔

(صاحب زادے بلند اقبال کو اسکول میں پڑھایا)

احمد جمال پاشا کے کالموں میں کچھ خالص مزاحیہ ہیں۔ یہ عوام کے ذوق اور ان کی تسکینِ طبع کے لیے مفید ہیں۔ لذّتِ بیان ان کی اہم خاصیت ہے لیکن اس لذّتِ بیان نے کہیں بھی ''لذّتِ آوارگی'' کی صورت نہیں اختیار کی ہے۔ ''لارس اسکیم'' میں جنسیات پر بھی بڑی ہوشیاری سے اظہار خیال کیا ہے۔ ''انسان بجلی گھر''، ''کنٹری''، ''لیٹ گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل''، ''دہی مچھلی''، ''جیبی ٹیلی فون''، ''افطاریاں''، ''کھمبا گزٹ''، ''رکشے والے''، ''ہندی میں انگریزی''، ''لندن کے بھوتوں کی پریشانی''، ''صنفِ مضبوط''، ''روحوں سے ملاقات''، ''سردی کی لہر''، ''فلمی اسٹائل''، ''شب برات کا جلوہ اور گڑ کا حلوہ''، ''برا نہ مانو ہولی ہے'' اور ''بیوی ہتھیاؤ آندولن'' میں مزاح کی جو دھیمی لہر ہے وہ ذہن پر بڑا خوش گوار اثر مرتب کرتی ہے۔ احمد جمال پاشا یوں تو اپنے اندازِ بیان سے ہی مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں انھوں نے مبالغے کی تکنیک سے بھی کام لیا ہے۔ مبالغے کا ایک مختصر نمونہ پیش ہے:

''ایک گھر کے اندر سے ایک نہایت ہی منشی قسم کے بزرگ ہاتھ میں اخبار لیے برآمد ہوئے اور بولے: ''کیوں جی! یہ چین کدھر ہے؟ شیخ صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''یہ علاقہ اجمیر شریف کے آگے ہے''۔ 'نا صاحب! جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے یہ گجرات کے آگے ہے'۔ شیخ صاحب لاکھ امیدوار سہی مگر رئیس کی خو بو کہاں جاتی۔ ان سے اس فاش جغرافیائی غلطی پر نہ رہا گیا اور تقریباً چیخ کر بولے، مگر گجرات تو آسام کے آگے ہے۔ مزار شریف سے صاف نظر آتا ہے''۔ (الکشن اور سلکشن)

احمد جمال پاشا کے مضامین کی بہ نسبت ان کے کالموں کے موضوعات میں زیادہ تنوع ہے۔ ان کے مضامین زیادہ تر ادبی مسائل کے اردگرد گھومتے ہیں جب کہ کالموں میں سماجی اور معاشرتی موضوعات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ایک اور بات یہ کہ ان کے مضامین میں جو گہرائی اور تہہ داری ہے کالموں میں اس کا

فقدان نظر آتا ہے۔ پاشا صاحب کے چند کالم ایسے ہیں جنھیں بعد میں انھوں نے اضافے کے بعد مضامین کی شکل عطا کردی۔ جیسے ''صورتِ حال قابو میں ہے''، ''تاریخی عمارتیں جو کثرتِ استعمال سے اسلامی ہوگئیں'' اور ''کمنٹری'' پہلے کالم کی صورت میں شائع ہوئے پھر وہ بعد میں بالترتیب ''حالات قابو میں ہیں''، ''اوکیات'' اور ''ستم ایجاد کرکٹ اور میں بے چارہ'' کے عنوان سے مضامین کی صورت میں طبع ہوئے۔ ان کالموں اور مضامین کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ مضامین جتنی توجہ اور محنت کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں کالم نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کالم نگاری کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجبوری کو کالم نگار ڈھال نہیں بنا سکتا اور نہ اسے فن سے انحراف کے جواز کے طور پر پیش کرسکتا ہے۔ پاشا صاحب چاہتے تو وہ محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی ان کالموں کو اس سے زیادہ بہتر طور پر پیش کرسکتے تھے۔ یہ بات بھی کہی جاچکی ہے کہ احمد جمال پاشا کے ڈھائی سو کالموں میں سے پچاس کے قریب ہی ایسے ہیں جو فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ باقی کالموں میں چند تو بالکل ناکام ہیں کچھ میں صرف لطیفوں کا سہارا لیا گیا ہے اور بقیہ کالموں میں صحافتی رنگ غالب ہے۔ ان میں تخلیق کے اس جوہر کی کارفرمائی نظر نہیں آتی جو کسی تحریر کو ادب پارہ بناتی ہے۔

اردو مزاحیہ کالم نگاری کے تذکرے میں احمد جمال پاشا اپنے نمائندہ کالموں کی وجہ سے جگہ پانے کے مستحق ضرور ہیں لیکن انھیں وہ مقام نہیں دیا جاسکتا جو ان کے ممتاز معاصرین فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین کو معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے حاصل ہے۔

حواشی:

(۱) اردو کی مزاحیہ صحافت۔ احمد جمال پاشا (غیر مطبوعہ)

(۲) پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی (کالم نگار نمبر) مرتبہ فکر تونسوی۔ اشاعت ۱۹۸۴ء ص ۱۰

(۳) پاشا صاحب نے اپنے کالموں کے تراشے مجھے عنایت کیے تھے۔ ان پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

(۴) اردو صحافت۔ مرتبہ انور علی دہلوی۔ مضمون مزاحیہ کالم نگاری از مجتبیٰ حسین اردو اکادمی دہلی اشاعت فروری ۱۹۸۷ء ص ۲۲۲

(۵) احمد جمال پاشا کی کالم نگاری۔ سید حسن عباس۔ ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' راولپنڈی مئی ۱۹۸۴ء ص ۱۰۸

تنقید نگاری

حالیؔ سے لے کر کلیم الدین احمد اور آلِ احمد سرور سے لے کر وزیر آغا، ممتاز حسین، محمد علی صدیقی، وہاب اشرفی، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، شمیم حنفی اور ابوالکلام قاسمی تک اردو تنقید نے ترقی کی مختلف منازل طے کی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو تنقید کا سرمایہ بہت زیادہ قابلِ فخر نہیں تو اتنا غیر تشفّی بخش بھی نہیں ہے لیکن اس تنقیدی سرمایے کو اصناف کے اعتبار سے مختلف خانوں میں بانٹ کر دیکھیں تو صورتِ حال مختلف نظر آتی ہے۔ اردو تنقید کا بیش تر حصہ غزل، افسانے اور ناول سے متعلق ہے۔ جہاں تک اردو طنز و ظرافت سے متعلق ہماری تنقید کا سوال ہے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا کوئی باضابطہ ناقد نہیں۔ چکبستؔ کی کتاب ''گل دستہ پنچ''، وزیر آغا، فرقت کاکوروی، رشید احمد صدیقی، نامی انصاری، مظہر احمد کی کتابیں، کلیم الدین احمد کا ایک طویل مضمون، مولانا عبدالباری آسی کا ''خندۂ گل''، کچھ ظرافت نگاروں کے انفرادی اور اجتماعی جائزے اور چند رسائل کے خصوصی نمبر وغیرہ۔ یہ ہے اردو ظرافت پر تنقید کی کل کائنات۔ بیش تر جائزے بے حد سرسری اور متضاد خیالات کے حامل ہیں۔ یہاں تک کہ رشید احمد صدیقی کی کتاب ''طنزیات و مضحکات'' بھی تنقید کا کمزور ترین نمونہ ہے۔

اردو ظرافت سے متعلق تنقید کی بے بضاعتی کا احساس احمد جمال پاشا کو شدّت سے تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنے طور پر بہت کوششیں کیں۔ ''ملاّ نصر الدین کے لطیفے''، ''ہجویاتِ میرؔ''، ''فنِ لطیفہ گوئی''، ''شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت''، ''اردو کے پانچ مزاحیہ شاعر'' اور ''ظرافت اور تنقید'' اسی سلسلے کی کتابیں ہیں۔ ''شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت'' اور ''ظرافت اور تنقید'' کے علاوہ باقی کتابیں تالیفات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مضامین رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ احمد جمال پاشا نے ''ظرافت اور تنقید'' کے دیباچے میں اپنے مضامین کی تعداد سو سے اوپر بتائی ہے۔ راقم الحروف کی رسائی جتنے مضامین تک ہوسکی ان کی تفصیل پیشِ خدمت ہے:

(۱) پوسٹ مارٹم (تخلص بھوپالی) سرپنچ لکھنؤ ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۸ء (۲) سن (کذا) انیس سو باسٹھ کا بہترین ادب سالنامہ ''نمک دان'' کراچی ۔۲۳ر مارچ ۱۹۶۲ء (۳) سید ضمیر جعفری کے کتابی چہرے، جدّت اور انفرادیت'' مریخ، پٹنہ پہلی قسط دسمبر ۱۹۸۳ء دوسری قسط جنوری ۱۹۸۴ء (۴) سید عطا حسین عطا۔ ''نیرنگِ خیال'' راولپنڈی جنوری ۱۹۸۴ء (۵) مزاح نگاروں کے مسائل۔ ماہنامہ ''پونم'' حیدرآباد جنوری ۱۹۶۷ء (۶) اردو میں طنز و مزاح آزادی کے بعد۔ ''ہما'' دہلی جنوری ۱۹۸۶ء (۷) مزاح کے رنگ۔ ''آواز'' دہلی جولائی ۱۹۸۳ء (۸) فرقت کاکوروی کی ظرافت ''فروغِ اردو'' لکھنؤ فرقت نمبر جنوری فروری ۱۹۷۵ء (۹) بے ڈھب سیوانی کی ظریفانہ شاعری۔ کالج میگزین ڈی۔ اے۔ وی کالج سیوان بہار ۱۹۸۵ء ا (۱۰) اقبال کے کلام میں طنزیہ عناصر'' ۔'نیا دور' لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۷ء (۱۱) خطوطِ غالب میں ظرافت ''نقشِ ہائے رنگ رنگ'' غالب صد سالہ کمیٹی شعبۂ اردو۔ پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ۔ (۱۲) کنھیا لال کپور شخصیت اور فن۔ ''پروازِ ادب'' پنجاب ستمبر اکتوبر ۱۹۸۵ء (۱۳) ترقی پسند تحریک اور اردو طنز و مزاح۔ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی۔ نیا پبلی کیشنز دہلی ۱۹۸۷ء (۱۴) ضلع جگت کا فن۔ نیا دور لکھنؤ۔ یادِ رفتگاں نمبر اپریل۔ ستمبر ۱۹۸۸ء (۱۵) اپنچ اور شاد کا معرکہ ''زبان و ادب'' پٹنہ فروری ۔ مارچ ۱۹۷۹ء (۱۶) ابوالمز اح علاّمہ اسرار جامعی کے ادبی معرکے۔ ''شگوفہ'' حیدرآباد جولائی ۱۹۷۷ء (۱۷) ظریف لکھنوی کی شاعری۔ دوماہی شاخسار ''کٹک'' جلد۲ شمارہ ۲۔۳ (۱۸) یوسف ناظم کا ذکرِ خیر ''چنگاری'' دہلی شمارہ ۳۸ ۱۹۸۴ء (۱۹) علی عباس حسینی کا ایک مزاحیہ کردار، حکیم بانا (مطبوعہ) (۲۰) نکولائی وسیل یوچ گوگول۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۱۵۔۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء (۲۱) کنھیا لال کپور پر اودھ پنچ کا ایک یادگار نمبر (غیر مطبوعہ) (۲۲) ترقی پسند ادبی ظرافت کے چالیس سال (غیر مطبوعہ) (۲۳) نظر برنی، طنز اور تحریف کا منفرد شاعر (غیر مطبوعہ) (۲۴) اکبر کا قلم (غیر مطبوعہ) (۲۵) اردو کی مزاحیہ صحافت (غیر مطبوعہ) (۲۶) اردو ظرافت میں دانشورانہ فکر، آزادی کے بعد۔ مشمولہ ''اردو میں دانشوری'' مرتبہ عابد رضا بیدار خدابخش لائبریری پٹنہ ۱۹۹۵ء (۲۷) طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ از خواجہ عبدالغفور ''معیار و تحقیق'' پٹنہ شمارہ۲، ۱۹۹۱ء (۲۸) اودھ پنچ لکھنؤ کی طنز و ظرافت انیسویں صدی عیسوی کے دوران۔ ''ادراک'' گوپال پور (سیوان) جنوری۔ مارچ ۲۰۰۱ء (۲۹) اردو ظرافت پر تنقید کا مسئلہ (''آمد'' پٹنہ اپریل۔ جون ۲۰۱۲ء) (۳۰) اندر جیت لال کی مسکراہٹ (مطبوعہ) (۳۱) احمد ندیم قاسمی بہ حیثیت طنز

نگار (غیر مطبوعہ) (۳۲) اسکیچ کا فن (غیر مطبوعہ)۔

مذکورہ مضامین کے علاوہ احمد جمال نے غیر ظریفانہ ادب پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ ان کی تفصیل بھی ملاحظہ ہو:

(۱) بچوں کا ادب۔ زبان و ادب پٹنہ نومبر دسمبر ۱۹۷۹ء (۲) پنڈت دیا شنکر نسیم اور ان کی مثنوی گلزارِ نسیم۔ ''شیرازہ'' سری نگر مئی ۱۹۶۵ء (۳) تصوّرِ بشر اور اقبال کا مردِ مومن۔ ''فن کار'' حیدرآباد جنوری ۱۹۸۵ء (۴) محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات۔ ''ادیب'' علی گڑھ جنوری مارچ ۱۹۸۳ء (۵) انشائیہ کی اصطلاح۔ کتاب نما دہلی پہلی قسط اکتوبر ۱۹۸۳ء، دوسری قسط نومبر ۱۹۳۸ء (۶) ضربِ کلیم سے ضیائے کلیم تک۔ کتاب نما دہلی جنوری ۱۹۸۹ء (۷) اردو ڈراما آزادی کے بعد (غیر مطبوعہ) (۸) جدیدیت کی تحریک اردو ادب میں (غیر مطبوعہ) (۹) اردو صحافت اتر پردیش میں (غیر مطبوعہ) (۱۰) فنونِ لطیفہ دربارِ اودھ میں (غیر مطبوعہ)۔

احمد جمال پاشا اردو کے نقادوں میں کلیم الدین احمد کو سب سے افضل تسلیم کرتے تھے۔ کلیم صاحب کی تنقید کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اسے کسی مخصوص خانے میں رکھ کر اس پر بحث نہیں کی جاسکتی۔ وہ تنقید کے روایتی دبستانوں سے بچ کر چلتے ہیں۔ ان کا اصل زور فن پر ہوتا ہے۔ احمد جمال پاشا بھی کلیم صاحب کی طرح فنی پہلو پر ہی توجہ دیتے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی نظریۂ تنقید نہیں۔ ان کے نزدیک ادب صرف ادب ہے۔ اگر کوئی ادب پارہ فنی اصولوں پر کھرا نہیں اترتا تو وہ ادب کے علاوہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ایک جملہ انھوں نے لکھا ہے کہ تنقید کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی صنف، فن کار یا فن پارے پر نقد کے ذریعے اپنی نپی تلی رائے پیش کردی جائے (۱) جو نقاد ادب کو مختلف خانوں میں بانٹنے کے عادی ہیں پاشا صاحب ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں:

> ''پہلے یہ تنقید کو کلاسیکی، جمالیاتی، تاثراتی، نفسیاتی، سماجی اور مارکسی خانوں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں جیسے کبوتروں کی کابک میں گرہ باز، شیرازی، لقّا اور گولہ وغیرہ کو۔ زمین تک آتے آتے کبوتر بٹیروں میں تبدیل ہوکر پالیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ ان ڈھرے کی میکانکی تنقیدوں میں قاری کو ترقی پسندی، جدیدیت، مقصدیت، مارکسیت، سماجی کش مکش، ادب برائے زندگی اور ادب

برائے ادب کی اصطلاحی پریڈ کرائی جاتی ہے''۔(۲)

پاشا صاحب اپنی تنقیدوں میں قارئین کو ''اصطلاحی پریڈ'' نہیں کراتے۔ وہ فن پارے کا تجزیہ کرتے ہوئے مثالوں سے اپنی بات واضح کرتے ہیں اور تب کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

احمد جمال پاشا کی تنقید اس لیے بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان کے موضوعات نئے ہیں۔ ''فنِ لطیفہ گوئی''، ''شہرۂ آفاق ظریف ملانصرالدین''، ''غالب کے ایک ممتاز کارٹونسٹ وہاب حیدر''، ''صاحبِ صدق کا نثری اسلوب''، ''الجھپٹ''، ''اردو کا ایک قلمی ظریف اخبار''، ''حاجی لق لق کی عیدیاں''، ''ضلع جگت کا فن''، ''اردو میں دانشورانہ فکر، آزادی کے بعد''، ''اردو ظرافت پر تنقید کا مسئلہ'' وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر پہلی بار پاشا صاحب نے تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ لطیفہ ظرافت کی ایک اہم شاخ ہے۔ اردو کے اہم ظرافت نگاروں نے اس سے خاصا کام لیا ہے۔ رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمٰن وغیرہ سب نے اپنے مضامین میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ خواجہ عبدالغفور کے تو مضامین کی اساس ہی لطیفوں پر ہوتی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر کسی نے آج تک لطیفے کے فن پر نہیں لکھا۔ احمد جمال پاشا نے ''فنِ لطیفہ گوئی'' میں لطیفے کی تعریف، اس کی خصوصیات، جزئیات، اقسام اور اس کی تاریخ کے بارے میں بصیرت افروز بحث کی ہے اور اسے روحِ فصاحت اور نشاطِ روح کا درجہ دیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> ''لطیفے کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جاسکتا ہے اسی لیے اس کے پلاٹ اور مکالمات کا اتحادِ عمل اپنے ایجاز کی مدد سے مزاحیہ فضا کی تعمیر کرتا ہے۔......ضروری ہوتا ہے کہ اس کے محاکاتی جلووں میں حسنِ ادا و حسنِ بیان کی پرچھائیاں بھی ہوں تاکہ جملوں کا رکھ رکھاو بیتے ہوئے الفاظ میں ہنسی کے بلبلوں کی صورت میں ظاہر ہو سکے۔ اندازِ بیان، طرزِ ادا، اسلوب و خیال کے عمومی سانچے، سماجی افراد کی ذہنی ساخت و رجحانات سے ہم آہنگ ہوں تاکہ ان لطائف کا تاثر کچھ اور شدید گہرا اور دیرپا ثابت ہو سکے۔ لطیفہ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی دنیا میں جہاں حسن و دل کشی، سرور و سرخوشی رقصاں نظر آئے وہاں سماج کے جن افراد کے لیے یہ پیش کیا گیا ہو وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکیں۔(۳)

لطیفہ اجمالی مزاحیہ ہے، اس مزاحیہ فضا کی تعمیر، پلاٹ اور مکالمات کے اتحادِ عمل اور ایجاز کی مدد

سے ہوتی ہے۔ اس کے محاکاتی جلووں میں حسنِ ادا و حسنِ بیان کی پرچھائیاں ضروری ہیں۔ جملوں کا رکھ رکھاو بیتے ہوئے الفاظ میں ہنسی کے بلبلے کی صورت میں ظاہر ہو، لطیفے میں انوکھے پن کے خمار کے ساتھ ساتھ حبابی کیفیت موجود ہوتا کہ اسے خندۂ قلقل کہا جا سکے، ان خیالات سے انکار یا اختلاف ممکن نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ تنقید نگار نے اپنے موضوع پر کتنی محنت کی ہے اور لطیفے کی ایک ایک جزئیات پر کتنی گہرائی، باریکی اور دقّتِ نظری سے غور و خوض کیا ہے۔ لطیفے کی چار اقسام تبسم آفریں، خندۂ دنداں نما قہقہے اور کثیفے کی وضاحت، لطیفے کی پیدائش، ارتقا اور لطیفہ گو حضرات کی خدمات کے علاوہ لطیفے کے زوال کے اسباب پر پاشا صاحب نے جو روشنی ڈالی ہے وہ بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے:

> ''......اب کوئی سعادت علی خاں نہیں جو انشاء کے لطیفے سنے، کوئی بہادر شاہ ظفر نہیں جو مرزا کو ان کے حسنِ طلب کی داد دے، وہ باغ و بہار شخصیتیں اب اس قدر عام نہیں کیونکہ اب ان کے قدرداں نہیں۔ یہ سب فراغت کی باتیں تھیں جو بادشاہت، جاگیرداری، زمینداری کے ساتھ رخصت ہوئیں......وزیر اور ندیم کی جگہ مسخرے، بھانڈ اور مفت خورے زیادہ دن نہیں رہ سکے۔ انھوں نے آتے ہی اس قدر دھول اڑائی کہ لطیفے کا دامن گرد و غبار سے اٹ گیا......شیخ چلّی کی جگہ شیخ سدّو آئے......لطیفہ دربار سے نکل کر بازار میں آیا۔ ضلع جگت اور پھبتیاں اس پر حاوی ہوگئیں۔ ان نوازشات کا یہ اثر ہوا کہ لطیفہ گوئی کا بلند معیار گرنے لگا۔ علماء کی جگہ جہلا نے سنبھال لی۔ اجنبی ہاتھ اسے سنبھال نہ سکے۔ ردِعمل کے طور پر خواص و عوام کی ذہنی سطح پست ہونے لگی''۔(۴)

احمد جمال پاشا کے ظریفانہ مضامین میں جو حیثیت ''ادب میں مارشل لا'' کی ہے، ان کے تنقیدی مضامین میں وہی مرتبہ ''فنِ لطیفہ گوئی'' کا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں مضامین ان کی ادبی زندگی کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''فنِ لطیفہ گوئی'' ۱۹۵۵ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوا تھا۔ پچاس برس سے زیادہ کی مدّت گزر جانے پر لطیفے کے فن پر اس سے زیادہ جامع مضمون نہیں لکھا جا سکا اور نہ کسی نقاد نے اس پر کوئی قابلِ قدر اضافہ کیا۔ یہ احمد جمال پاشا کے بالیدہ تنقیدی ذہن اور ان کی طبعی درّاکی کا روشن ثبوت ہے۔

''غالب کے ایک ممتاز کارٹونسٹ وہاب حیدر'' میں احمد جمال پاشا نے وہاب حیدر کے مختصر حالات اوران کی رندانہ زندگی کے ساتھ ان کے کارٹونوں کی خصوصیات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہاب حیدر نے کارٹون کے ذریعے غالب کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ اس کا سہارا لے کر جہاں مرزا کی زندہ دلی اور خوش مذاقی کو نمایاں کیا ہے وہیں دورِ حاضر کی انسانی کمزوریاں بھی ظاہر کردی ہیں۔ یہ کارٹون ادب، مزاح اور مصوّری کا خوش گوار امتزاج ہیں:

''وہاب حیدر نے نظم ونثر کے دامن سے غالبؔ کی ابدی خلش اور لذّتِ چبھن کو سمیٹ کر تصویر کے پردے میں عریاں کردیا ہے......(وہ) جلوۂ گل کے ذوقِ تماشا کے لیے مرزا کی طرح چشم کو ہر رنگ میں وا کرنے کے قائل ہیں''۔(۵)

اردو میں کارٹون اور کارٹونسٹوں کے فن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ایسے میں احمد جمال پاشا نے ایک ایسے فن کار کو خوبصورت خراجِ تحسین پیش کیا جو زندگی بھر غالب کے اشعار کی ظریفانہ تشریح اپنے کارٹونوں کے ذریعے کرتا رہا۔ اس کے لیے پاشا صاحب نے مواد بھی ریزہ ریزہ کرکے جمع کیا اور بڑی دل جمعی کے ساتھ وہاب حیدر کے کارٹونوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ اپنے موضوع پر یہ مختصر مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

''ضلع جگت کا فن'' اردو میں اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ احمد جمال پاشا نے اس فن کی خصوصیات کے ضمن میں پس منظر کے طور پر لکھنوی آداب، نفاست اور مجلسی رکھ رکھاو کا بیان کیا ہے۔ مہاراجا سرکشن پرشادؔ نے اپنی تصنیف ''ضلع جگت'' میں ضلع اور جگت کی جو تعریف کی ہے(۶) احمد جمال پاشا نے اسی کو اپنے الفاظ میں دہرا دیا ہے لیکن انھوں نے لکھنؤ کی مجلسی زندگی میں زبان کی بے تکلفی اور رعایتِ لفظی کے قدم قدم پر اہتمام کا ذکر کرتے ہوئے ضلع جگت کا تعلق پھبتی اور ایہام گوئی کے ساتھ جس طرح جوڑا ہے وہ ایک نئی چیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس کی ابتدا دراصل پھبتی سے ہوئی۔ لکھنؤ اپنی پھبتی بازی میں یوں بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ پھبتی کا تعلق تشبیہہ اور استعارے سے ہے۔ پھبتی کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی آدمی یا چیز کو بگاڑ کر دکھانا، اس کے عیوب کو نمایاں کرنا۔ اس کا تعلق برجستگی اور حاضر جوابی سے ہے جس میں دور کی کوڑی لانا پنہاں ہے...........اردو

شاعری کی ابتدا ریختہ گوئی سے ہوئی تھی۔ ریختہ کے دورِ ثانی میں ایہام گوئی کا زور تھا۔ ایہام کا دارومدار ذومعنیٰ الفاظ پر تھا جس کے اثرات زبان اور نثر نے بھی قبول کیے اور انھی ریختہ گویوں کے ساتھ ذومعنیٰ الفاظ اور رعایتِ لفظی کا چسکہ لکھنؤ بھی پہنچا جس نے ترقی پاکر ''ضلع جگت'' کی شکل اختیار کرلی''۔(۶)

اسی مضمون میں جگت استاد منشی چندر یکا پرشاد جنوںؔ اور سرکشن پرشاد شادؔ کے فن کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے پاشا صاحب نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ان دو بڑے اساتذہ کے مزاج اور مذاق میں وہی فرق ہے جو انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں نظر آتا ہے۔ شادؔ اگر انیس ہیں تو جنوں دبیر۔

احمد جمال پاشا نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان میں وہ کہیں کہیں دوسرے نقادوں کی آراء اور خیالات سے متاثر ہوئے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انھوں نے مکھی پر مکھی ماری ہے۔ ہر موضوع پر ان کی اپنی سوچی سمجھی رائے موجود ہے۔ یہ چیز ذہانت، غور وفکر، مطالعے کی وسعت اور گہرائی کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کی تنقیدوں سے بہت سے مفروضات کا بطلان ہوا ہے۔ مثلاً ''اودھ پنچ'' کے متعلق چکبست کی یہ رائے سند کا درجہ اختیار کرچکی ہے کہ:

''قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلا معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلا درجے کی ظرافت نہیں کہہ سکتے''۔(۷)

لیکن احمد جمال پاشا نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ ہر چند کہ وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''اودھ پنچ'' ہو یا ''اپنچ'' ہنگامی صحافت نے گرمیِ بازار کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ اس دھوپ چھانو میں موسم کا اندازہ آسانی سے نہیں ہوسکتا۔ پنچایتی ہنگاموں میں جماعتی توازن اور اعتدال کی سج دھج ممکن نہیں ۸؎ مگر وہ ''اودھ پنچ'' کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''اودھ پنچ'' کی ظرافت میں مذاقِ سلیم دیکھنا ہو تو ستم ظریف کو پڑھیے اور لطف اندوز ہوئیے۔ بہترین مزاح کے لیے سرشارؔ اور منشی سجادؔ حسین کا مطالعہ کیجیے۔ ظرافت اور طنز سے لطف اندوز ہونا ہو تو اکبر اور ظریفؔ کا مطالعہ کیجیے۔ تحریف سے محظوظ ہونا ہو تو آزاد کا تفصیل سے مطالعہ کیجیے ۹؎ پاشا صاحب نے ''اودھ پنچ'' کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

''اردو میں پرانی ظرافت کا نشانہ فرد تھا۔ ''اودھ پنچ'' نے پہلی بار طنز وظرافت کے

رنگ میں معاشرہ نگاری کی ابتدا کی۔اس سے اصلاح،مقصد نگاری اور سماجی عکاسی کا کام لیا۔قدیم و جدید کی کش مکش میں اس نے بڑی بے باکی سے ہندستانی تہذیب ومعاشرت کا ساتھ دیا اور مشرق کی ترجمانی کا حق ادا کیا......اس نے ہمیشہ برسرِاقتدار طبقے کے مقابلے میں عوام کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ اس کی وکالت کا بھی فرض ادا کیا اور قومی تحریکات میں حصہ لے کر جنگِ آزادی کے ہراول دستے کا کام دیا۔''اودھ پنچ'' نے سب سے پہلے قومی بیداری کا بگل بجایا......اس کے لہجے میں تلخی بھی ہے اور شوخی بھی۔قہقہے بھی ہیں اور مسکراہٹ آمیز آنسو بھی۔یہاں ہنسی برائے ہنسی نہیں بلکہ بامقصد ہے......''اودھ پنچ'' نے پرانی روش سے ہٹ کر طنز ومزاح کا خود ایک دبستان قائم کیا۔ظرافت کے فن کے بہترین شاہکار پیش کیے اردو ادب کو اعلا درجے کی ظرافت سے مالا مال کر دیا''۔[۱۰]

''اودھ پنچ'' کے بارے میں پاشا صاحب کی یہ رائے حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔جو لوگ ''اودھ پنچ'' کی ظرافت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے ان کے خیالات اس وجہ سے ناقابلِ بھروسہ ہیں کہ اس مزاحیہ اخبار کے تعلق سے لکھتے وقت یہ لوگ اس کی ظرافت کو سستی اور چکبست کے حوالے سے قوموں کے مذاقِ سلیم کے معیار کے مطابق نہیں سمجھتے مگر یہی اصحاب جب انفرادی طور پر منشی سجاد حسین، سرشار، اکبر، ستم ظریف، سید محمد آزاد، عبدالغفور شہباز وغیرہ کے فن پر لکھتے ہیں تو تعریفوں کے انبار لگا دیتے ہیں۔حالاں کہ ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والے یہی مذکورہ بزرگ تھے جو اس میں پابندی سے چھپتے تھے۔

رشید احمد صدیقی کی ظرافت اور اس کی تہہ داری کے سبھی نقاد قائل ہیں۔ان کے پھڑکتے جملوں اور ان کی تہہ داری ومعنویت کا تذکرہ بہت ہوا ہے۔یہاں تک کہ رشید صاحب کو ظرافت کے ایک اسکول کی حیثیت عطا کر دی گئی ہے۔مگر ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ ''مضامین رشید'' اور ''خنداں'' کے بعد رشید احمد صدیقی نے جو مضامین لکھے وہ انشا پردازی کے لحاظ سے ضرور بلند پایہ ہیں لیکن ظرافت کے اعتبار سے انھیں کامیاب کہنے میں تامل ہوتا ہے۔رشید صاحب کے اس فنی پہلو پر کم توجہ دی گئی ہے۔رشید صاحب پاشا صاحب کے استاد تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان کی اس خامی کی جانب اشارہ کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

''مضامینِ رشید کے بعد جہاں رشید احمد صدیقی کے طنز اور خیالات میں گہرائی آتی گئی وہاں ان کی شوخی اور خوش طبعی میں کمی ہوگئی......'عزیزانِ ندوہ' اور 'سرگذشتِ عہدِ گل' یا بعد کے مضامین ایک مفکر اور فلسفی کے خیال پارے ہیں۔دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی مقابلہ نہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ رشید احمد صدیقی بہترین طنز نگار، مزاح نگار، خاکہ نگار، مرقع نگار اور سوانح نگار ہیں۔یہ بھی درست ہے کہ ''آشفتہ بیانی میری'' سے بہترین نمونہ ہمارے ادب میں نہیں ملتا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ عمر، تجربے، مشق اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ظرافت سنجیدگی میں بدلتی چلی گئی۔ان کی تازہ تحریریں انھیں ایک بیدار مغز مفکر کے روپ میں تو ضرور پیش کرتی ہیں مگر مضامینِ رشید والی تہہ دار ظرافت اور لطیف ترین طنز کا ان میں کوئی بھی پرتو نہیں ہوتا۔جذبہ پر عقل واستدلال کی یہ برتری اردو ادب کے لیے فالِ نیک ہو تو ہو مگر اردو ظرافت کے لیے محرومی کے سوا کچھ نہیں۔''[۱۱]

احمد جمال پاشا نے ظرافت کے جو اجتماعی جائزے لیے ہیں ان میں وہ مختصر الفاظ میں بڑے پتے اور کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ظرافت نگاروں کے شخصی جائزے میں وہ غیر جانب دار رہنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔وہ جس مصنف پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ساتھ ہمدردانہ رویہ بھی رکھتے ہیں۔تنقید میں ہمدردی کوئی بری چیز نہیں لیکن جب اس کا رنگ گہرا ہو جائے تو تحریر میں لغزش کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔پاشا صاحب کی تنقیدوں میں ہمدردی کے ہلکے اور شوخ دونوں ہی رنگ نظر آتے ہیں۔''ہجویاتِ میر''، ''پطرس بخاری''، ''ظریف لکھنوی کی شاعری''، ''سید ضمیر جعفری کے کتابی چہرے'' میں انھوں نے فن کاروں کا بڑا بے لاگ تجزیہ کیا ہے۔میر کی ہجو نگاری پر اظہارِ خیال کرتے جہاں انھوں نے محتسب کی ہجو رکیک اور فحش قصوں کے نظم کیے جانے پر روشنی ڈالی ہے وہیں ان ہجویات کی خصوصیات کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے:

''ان ہجویات میں سماجی حالات کا عکس اور نظامِ معاشرت کے واضح اثرات ملتے ہیں......ان ہجویات سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ زبان کی طرح دل کے بھی برے ہیں۔بس یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ یہ سب دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کر رہے ہیں مگر اس عداوت کے غبار میں ذاتی کدورت سے زیادہ زمانے کا شکوہ ہے۔بغیر

طنز کے ہجو بے جان ہوتی ہے مگر میرؔ کے یہاں طنز کی اتنی فراوانی ہے کہ ان کے سنجیدہ کلام میں بھی اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس طنز میں حاسدانہ سفلے پن کے بجائے سوزشِ قلب و جگر ہے، اس میں اس آگ کی گرمی ہے جس میں میرؔ خود جل رہے ہیں''۔

''فنِ لطیفہ گوئی'' کے بعد ''پطرس بخاری'' احمد جمال پاشا کا بہترین تنقیدی مضمون ہے۔ پطرسؔ خالص ظرافت کے نمائندہ فن کار ہیں۔ بہتوں نے ان کی خوشہ چینی کی۔ پاشا صاحب نے اس مضمون میں پطرس کے لطیف مذاقِ زندگی، ان کے سوچنے کا مزاحیہ انداز، اپنے اوپر ہنسنے کی پوری قدرت، مضحکہ خیز خیال، واقعات و اندازِ بیان کی مضحک کیفیات، واقعات کے نشیب و فراز سے ماہرِ نفسیات کی طرح گزر جانا، زبان و بیان کی خوبیاں، سادگی، شگفتگی اور آمد و روانی کو نمایاں کیا ہے۔ مغرب کا اثر ان کے یہاں کتنا ہے اور یہ کس طرح عالمگیر رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، مغربی انداز کی خارجیت، ٹھہراو اور اعتدال ان کے جذبات کو کس طرح روکے رکھتے ہیں، یہ آگ ان کے سینے میں دب کر کیسے گلزارِ ابراہیم کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور ہمارے قلب و نظر کو آزماتی ہے وغیرہ کا بیان بھی بہت واضح ہے۔ اس مضمون کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے غالبؔ اور پطرسؔ کا تقابلی تجزیہ کیا ہے:

''ایک (غالبؔ) نے ناکامیوں سے کام لے کر مشکلوں کو آسان کر لیا تھا اور دوسرے (پطرسؔ) کے سر اتنا کام آ پڑا کہ نمٹ نہ سکا...... غالبؔ کو مرنے کی فرصت نہ تھی ان کو جینے کی فرصت نہ مل سکی۔ ایک کو اپنے مزاح نگار ہونے کا علم بھی نہ ہو سکا دوسرے کو لوگوں نے احساس بھی کرا دیا تو کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک نے اپنی شخصیت کا اظہار شاعری میں کیا مگر اس کے دامن کو تنگ پا کے خطوط کا سہارا لیا۔ دوسرے نے محض چند مضامین، خطوط اور تقاریر پر اکتفا کیا۔ عملی زندگی کی مصروفیات اور ذمے داریوں نے شخصیت کے ارتقا کے دوسرے راستے ڈھونڈ لیے...... اختصار میں پطرس غالب سے بھی آگے بڑھ گئے۔ غالبؔ نے لکھنے پڑھنے کے بعد انتخاب کیا تھا اور انھوں نے انتخاب کر کے لکھا۔ دونوں کا اعجاز ایجاز میں نمایاں ہوا''۔[۱۳]

ظریفؔ لکھنوی ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ پاشا صاحب کا خیال

ہے کہ ظریفؔ زمانے سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ اپنے وقت کی اصلاحی تحریکوں سے متاثر بھی رہے مگر اس کے باوجود ان کے یہاں گہرائی اور دور بینی کا فقدان ہے۔ ان کے کلام پر حالیؔ کا اثر آخر دم تک باقی رہا لیکن کوشش کے باوجود یہ اکبرؔ کی تقلید میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ظریفؔ اپنے کلام میں توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے یہاں فحش گوئی کا عنصر بھی خاصا ہے۔ پاشا صاحب نے ان کی اس خامی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی دوسری کمزوریوں کے متعلق کہتے ہیں:

''...... جب ناصحانہ انداز اختیار کیا تو جابجا متانت، ثقاہت اور ہضمیت نے بشاشت کو دبا کر انھیں واعظِ خشک بنا دیا۔ ان کی شاعری کا تعلق دل سے زیادہ دماغ سے ہو گیا جس کی وجہ سے آمد کو آورد نے جابجا دبا لیا۔ حکیمانہ خیالات میں لطافت و رنگینی برقرار رکھنے میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ بے باکی اور حریتِ فکر کی کمی (کی) وجہ سے قومی ادب میں وہ کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ کر سکے''۔[۱۴]

ان کمزوریوں کے باوجود انھیں اعتراف ہے کہ ظریف کے کلام کا سختی سے انتخاب کیا جائے تو ایسے گوہرِ آب دار نکل آتے ہیں جن کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور ایسی چنگاریاں اس خاکستر سے نکل آتی ہیں جن سے شعلے بلند ہو سکتے ہیں۔

ظریفؔ کے کلام پر پاشا صاحب نے جس بے باکی سے تنقید کی ہے اسی طرح اپنے معاصر خواجہ عبدالغفور کے تحقیقی مقالے ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ:

''...... اسی کے ساتھ مولوی عبدالباری آسیؔ کی ''تذکرہ خندۂ گل''، رشید احمد صدیقی کی ''طنزیات و مضحکات'' اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا اور 'اردو ادب میں طنز و مزاح'، فرقت کاکوروی وغیرہ سے بھی بلا حوالے کے مواد شامل کر لیا جس سے ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ' لطائف کا ایک ایسا جائزہ ہو گیا جس میں سوائے متواتر توارد اور سرقے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا''۔[۱۵]

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ پاشا صاحب ہر جگہ غیر جانب دار نہیں رہ پاتے ہیں۔ انھوں نے جو تنقیدی تبصرے لکھے ہیں ان میں یہ رنگ کسی حد تک نمایاں ہے۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ ''نظر برنی، طنز اور تحریف کا منفرد شاعر'' کے تحت شاعر کے دوسرے مجموعۂ کلام ''کف گیر'' پر اظہارِ خیال کیا گیا

ہے۔جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نظر برنی طنز اور تحریف کے منفرد شاعر ہیں لکھتے ہیں:

''نظر برنی کی حالاتِ حاضرہ کی ناہمواریوں پر گہری نظر ہے۔غلط سماجی رویوں کو وہ بڑی بشاشت سے اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ان کے طنز کا فن بہت ہی نکھرا ہوا ہے۔اس طنز کے بین السطور میں بہتر تبدیلی اور اصلاح کا شدید جذبہ کارفرما ہے......ان کا طنزیہ لہجہ بے حد نمایاں ہے۔زورِ بیان کے ساتھ جرأت، بے باکی اور حریتِ فکر بھی ان کے کلام میں جاری وساری نظر آتی ہے''۔۱۶؎

''کف گیر''میں پاشا صاحب کو جو کمزوری نظر آتی ہے وہ یہ ہے:

''کہیں کہیں ان کی جذباتیت سے فن مجروح ہوجاتا ہے۔موضوعات کی تکرار سے بھی ان کے طنز کی دھار کہیں کہیں کند ہوجاتی ہے......بیگم کا ذکر، گھریلو مذاق، سالے بہنوئی، داماد جیسے موضوعات......اور ضرورتِ مشاعرہ کے تحت کلام پر انھیں غور کرنا ہوگا''۔۱۷؎

یہ صحیح ہے کہ نظر برنی کے یہاں جذباتیت، موضوعات کی تکرار اور بیگم، سالے، بہنوئی جیسے پُر مذاق موضوعات موجود ہیں لیکن ان کے فن کا جو اصل عیب ہے اسے پاشا صاحب نے ظاہر نہیں کیا ہے۔جیسے نظر برنی کی فن پر گرفت نہیں، وہ ضروری اور غیر ضروری میں فرق محسوس نہیں کرتے۔وہ بحرِ ہزج''میں ''بحرِ رمل''ڈال کر چلنا شروع کردیتے ہیں اور ایسا بار بار کرتے ہیں لیکن انھیں اس کی خبر نہیں ہوتی۔وہ پھکڑپن اور ابتذال سے اپنا دامن نہیں بچا پاتے۔چند مقامات کے سوا انھوں نے طنز کرنے کی جو کوشش کی ہے ان میں بھی وہ بیش تر ناکام رہے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا اندازِ پیش کش خام ہے، ان کی تلوار میں کاٹ نہیں۔اعلا ظرافت کے لیے جس شایستگی، رکھ رکھاو اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ نظر برنی کے یہاں مفقود ہے۔''کف گیر''کے دیباچے میں انھوں نے دعوے تو بہت کیے ہیں لیکن یہ دعوے حقیقت سے پرے ہیں۔چند مثالیں دیکھیے:

کیا کریں ہر دیش میں پٹرول مہنگا ہوگیا — اب چلانا چاہیے موٹر کو بھی پیشاب سے
مٹھائی بانٹتے ہیں دادا جاں سارے محلّے میں — بڑھاپے میں ہوا ہے ان کے اک لختِ جگر پیدا

ذاتیات کا رنگ ملاحظہ ہو:

وہ وہابی نیاز کیا جانے — وہ نشیب و فراز کیا جانے
وعظ کرنا ہی جس کا پیشہ ہو — مغفرت کا وہ راز کیا جانے

''بحر ہزج میں بحر رمل''کی ایک مثال پیش ہے:

فریب، جھوٹ، جفا، مکر، چھل، کپٹ، غیبت — یہی ہے ابتدا تیری تو اس کی انتہا کیا ہے

شتر گربہ کی ایک مثال پیش ہے:

کہتی ہو تم نکما اور زن مرید ہم کو — بیگم تری زباں کی کیا کیا روانیاں ہیں۱۸؎

ان عیوب کے علاوہ نظر برنی کے یہاں بے وزن مصرعوں کی بھی کمی نہیں۔ایسی فاحش غلطیوں اور کمزوریوں کے باوجود کسی کو منفرد شاعر کہنا اور اسے ممتاز ترین شعراء کی صف میں شامل کرنا تنقیدی اصولوں کا خون کرنا ہے۔پاشا صاحب یہاں سخن فہم کم طرف دار زیادہ نظر آتے ہیں۔

احمد جمال پاشا پر محاکے کی منزل بھی سخت گزرتی ہے۔وہ فن پارے کا تجزیہ ضرور کرتے ہیں مگر اس تجزیے میں ہر جگہ وضاحت سے کام نہیں لیتے جس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔''کرشن چندر کی ظرافت''،''مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری''اور''طنزیاتِ مانپوری''میں یہ عیب موجود ہے۔ان کی تنقید کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات مسلسل اتنی کثرت سے مثالیں دیتے چلے جاتے ہیں کہ الجھن ہونے لگتی ہے اور تنقید''کثرتِ مثال''میں گم ہوکر رہ جاتی ہے۔''ماچس لکھنوی''،''فرمانِ ظرافت کا شاعر''،''حاجی لق لق کی عیدیاں''،''ہزل گوئی لکھنؤ میں''، ایسے ہی مضامین ہیں۔''ملا نصر الدین''ایک مستحسن کوشش ہے لیکن اس میں بھی اٹھائیس لطیفے نقل کردینے سے حجم تو ضرور بڑھ گیا ہے مگر تنقیدی فضا بری طرح مجروح ہوئی ہے۔

تنقید اور تحقیق میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔یہ کوئی ضروری نہیں کہ اچھا تنقید نگار اچھا محقق بھی ہو لیکن تنقید نگار کے یہاں تحقیقی بصیرت کا ہونا بہت ضروری ہے۔اس بصیرت کی کمی سے نتائج اخذ کرنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والا صاحبِ نظر اور صاحبِ فہم ہے لیکن وہ جس موضوع پر لکھ رہا ہے اس کے تمام پہلوؤں پر اس کی نگاہ نہیں۔ایسی حالت میں بھی غلطیاں ہونے کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔شبلی کی''موازنۂ انیس و دبیر''اور سودا کے کلام پر کی گئی تنقیدیں اس کی اہم مثالیں

ہیں۔اردو ظرافت پر احمد جمال پاشا کی نگاہ گہری تھی اس کے باوجود ان کی تنقید تحقیقی خامیوں سے پاک نہیں ۔چند مثالیں پیش ہیں:

(۱) ''اردو کی مزاحیہ صحافت کا آغاز ۱۸۴۵ء میں رام پور کے رسالہ 'مذاق' سے ہوا''۔۱۹

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

''اردو کی اخباری ظرافت کی ابتدا ۱۸۴۰ء میں 'مذاق' رام پور سے ہوئی''۔۲۰

ایک اور مقالے میں لکھتے ہیں:

''اردو کی مزاحیہ صحافت کی ابتدا جنوری ۱۸۵۵ء میں 'مذاق' رام پور کے اجرا سے ہوئی''۔۲۱

''مذاق'' کے اجرا کے سلسلے میں ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۵ء کی کوئی دوسری روایت نہیں ملتی۔ پاشا صاحب نے ان کا کوئی حوالہ بھی نہیں دیا ہے۔حوالہ تو ۱۸۵۵ء کا بھی نہیں ہے لیکن اس کی تصدیق دوسری جگہوں سے ہوجاتی ہے۔مولف ''اختر شاہنشاہی'' نے سب سے پہلے لکھا کہ مذاق ۱۸۵۵ء میں نکلا۲۲ عبدالسلام خورشید نے اختر شاہنشاہی کے حوالے سے یہی سنہ درج کیا۲۳ محمد عتیق صدیقی نے اردو اخبارات اور چھاپے خانوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں بھی ''مذاق'' کا سالِ اشاعت ۱۸۵۵ء ہی درج کیا ہے۲۴ لیکن ڈاکٹر نادر علی خاں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ''مذاق'' ۱۸۵۵ء میں نہیں بلکہ وہ اخبار ''سرورِ قیصری'' کے ضمیمے کے طور پر ۷؍جنوری ۱۸۸۵ء کو جاری کیا گیا تھا۔۲۵

(۲) ''اودھ پنچ'' کے اجراء سے پہلے کی ظرافت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اردو نثر میں خطوطِ غالب، فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مرزا ظاہر دار بیگ اور ابن الوقت کے مزاح کے نمونے پیش کیے جاچکے تھے......''۲۶

''ابن الوقت'' کا سالِ تصنیف ۱۸۸۸ء ہے۲۷ اور ''اودھ پنچ'' ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا تھا اس لیے ''اودھ پنچ'' سے پہلے ابن الوقت کے مزاح کے نمونے کی بات درست نہیں۔

''......پھر حاجی بغلول کو (کا) چہرہ دکھا کر ہنستوں کو لوٹ پوٹ کردیا اور پھر 'طرح دارلونڈی' پیش کردی۔''۲۸

رام بابو سکینہ۲۹ اور وقار عظیم۳۰ احمد جمال پاشا کی طرح طرح دار لونڈی کو منشی سجاد حسین کی ہی تصنیف مانتے ہیں۔ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر نے اپنے تحقیقی مقالے میں 'طرح دار لونڈی' کا مختصر پلاٹ بھی کسی حوالے کے بغیر درج کیا ہے۳۱ لیکن حقیقتاً یہ کتاب سجاد حسین کی تصنیف نہیں۔یوسف سرمست نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ''طرح دار لونڈی'' نہ ناول ہے اور نہ سجاد حسین کی تصنیف بلکہ یہ ڈراما ہے جو ''گڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز'' کے عنوان سے ۲۳؍جولائی ۱۸۷۸ء سے ''اودھ پنچ'' میں قسط وار چھپنا شروع ہوا اور بعد میں ۱۹۰۴ء میں ''طرح دار لونڈی'' کے نام سے بذریعہ مطبع شامِ اودھ چھپا۔اس کے مصنف مرزا احمد بیگ طرح دار لکھنوی ہیں۳۲ یوسف سرمست کے بیان کی تصدیق کالی داس گپتا رضا کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے۔ان کے مطابق:

''طرح دار لونڈی (یا آستین کا سانپ) مرزا احمد بیگ طرار لکھنوی کی تصنیف ہے۔یہ ۱۹۰۴ء میں مطبع شامِ اودھ لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔میرے کتب خانے میں اس کی ایک کاپی موجود ہے۔اخبار ''اودھ پنچ'' (جلد۴۴ ۱۹۱۹ء جو میرے پیش نظر ہے) میں اسے منشی سجاد حسین مرحوم کے ناولوں میں شمار کیا گیا ہے۔یہ غالباً سہو ہے۔منشی سجاد حسین مرحوم کے زمانۂ ادارت میں شائع ہونے والے اودھ پنچ میں طرح دار لونڈی کا ذکر نہیں۔حالانکہ ناول ۱۹۰۴ء میں چھپ گیا تھا''۔۳۳

یوسف سرمست اور رضا صاحب کے بیانات میں چند اختلافات ہیں لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ ''طرح دار لونڈی'' مرزا احمد بیگ کی ہی تصنیف ہے منشی سجاد حسین کی نہیں اور اس باب میں احمد جمال پاشا نے بھی دھوکا کھایا ہے۔

(۴) لکھنؤ میں ہزل گوئی سے بحث کرتے ہوئے ایک شعر عثمانی کے نام سے یوں نقل کرتے ہیں:

چھوڑ کر ہم نے امیری ، فقیری کی اختیار   بوریے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کے۳۴

پہلی بات تو یہ کہ موجودہ صورت میں شعر خارج از بحر ہے۔دوسرے یہ شعر عثمانی کا نہیں بلکہ خواجہ حیدر علی آتش کا ہے۔اصل شعر اس طرح ہے:

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار   بوریے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کے۳۵

(۵) ''پنڈت دیا شنکر نسیم......۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے......۲۵ سال کی عمر میں مثنوی

'گلزارِنسیم' لکھ کر اپنے استاد آتش لکھنوی کو دکھائی.....مثنوی کی اشاعت کے وقت
نسیم کی عمر صرف ۳۲ سال کی تھی اور اس کے ایک سال کے بعد صرف ۳۳ سال کی
عمر میں نسیم کا انتقال ہو گیا''۔۳۶

پاشا صاحب نے نسیم اور ان کی مثنوی کے متعلق اپنے ماخذ کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ اگر ان کے بیانات پر انحصار کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ''گلزارنسیم'' ۱۸۳۶ء میں لکھی گئی۔طباعت ۱۸۴۳ء میں عمل میں آئی اور نسیم کی وفات ۱۸۴۴ء میں ہوئی۔نسیم کے متعلق عموماً چکبست کے بیانات پر انحصار کیا جاتا رہا ہے جن کی مرتبہ ''گلزارنسیم'' ۱۹۰۵ء میں مطبع جے نارائن ورما، خیالی گنج لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔۳۷ چکبست کے بیانات سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔احمد جمال پاشا نے بھی چکبست پر ہی یقین کیا اور ٹھوکر کھائی۔ نسیم کی پیدائش ۱۸۱۱ء میں ہوئی اس بات پر سبھی محققین کا اتفاق ہے لیکن ''گلزارِنسیم'' کے سالِ تصنیف، سنہ طباعت اور پھر ان کی موت کے بارے میں اختلاف رائے ہے جس کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے۔البتہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مثنوی کے اختتام پر نسیم نے جو تاریخ نکالی وہ یہ ہے:

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد　　گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد　　توقیع قبول روزیش باد ۳۸
(۱۲۵۴ھ)

۱۲۵۴ھ کا عیسوی سنہ ۱۸۳۸۔۳۹ء ہے۔مثنوی کی پہلی طباعت نسیم کی زندگی میں ہوئی تھی اور انھوں نے قطعۂ تاریخ طبع بھی کہا تھا۔آخری شعر ہے:

گلزارِ نسیم شد چو مسموع　　گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع ۳۹
۱۲۶۰ھ

۱۲۶۰ھ کا سنہ عیسوی ۱۸۴۴ء ہے۔نسیم کے انتقال پر رشک لکھنوی نے ''مرد نسیم ز ہیضہ ہے ہے'' سے تاریخ نکالی تھی۔ (۱۲۶۱ھ)

۱۲۶۱ھ کا سنہ عیسوی ۱۸۴۵ء ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ ''گلزارنسیم'' ۱۸۳۸۔۳۹ء میں مکمل ہوئی۔۱۸۴۴ء میں پہلی بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اور نسیم کا انتقال ۱۸۴۵ء میں ہوا۔

احمد جمال پاشا کی تنقید کا اہم پہلو اس کا اسلوب ہے۔جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں پاشا صاحب کے پسندیدہ نقاد کلیم الدین احمد تھے۔کلیم الدین احمد نے ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' پر سخت تنقید کی ہے لیکن وہ حالی کے اسلوب کے قائل ہیں اور صحیح معنوں میں حالی کی زبان کو تنقید کی زبان قرار دیتے ہیں۔۴۰ کلیم صاحب نے اپنی تنقیدوں میں اس اسلوب کی پیروی بھی کی۔ احمد جمال پاشا نے بھی اپنی تنقید میں جو طرزِ تحریر اختیار کیا ہے وہ حالی اور کلیم الدین احمد کا اسلوب ہے یعنی اپنی بات کو صاف اور دوٹوک انداز میں کہنا اور کسی قسم کی ژولیدہ بیانی کو راہ نہ دینا۔پاشا صاحب کی باتوں میں الجھاؤ نہیں۔وہ اپنے خیالات کو سہل اور چھوٹے چھوٹے فقروں کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ان کے اسلوب میں کہیں کہیں طنزیہ رنگ بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے لیکن ایسا طنز نہیں جو وارث علوی کے یہاں موجود ہے۔ایک مثال دیکھیے:

''اردو تنقید کا حال کلیم الدین احمد سے پہلے کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ طلوعِ اسلام سے قبل اہلِ عرب کا۔کلیم الدین احمد اردو تنقید کے شاہنامہ کے رستم ہیں۔انھوں نے اردو تنقید کی ساری مہمات کو اپنے رخشِ خیال اور گرزِ گاوسر سے سر کیا ہے۔سوا تین سو من کا یہ گرز گاوسر جس کے بھی پڑ گیا پھر اس نے پانی نہ مانگا۔دوسری ضربات کا ذکر ہی کیا، کارزارِ نقد ابھی تک ان کی پہلی ضرب ہی سے نہیں سنبھل پائی ہے''۔۴۱

لیکن جب پاشا صاحب دنیائے نقد میں جوڑ توڑ اور سیاست کی بازی گری دیکھتے ہیں اور وہ اس صورتِ حال کا بیان کرتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ زیادہ تلخ ہو جاتا ہے۔ادب کی کسی ایک صنف پر اختصاص حاصل کرنے کے بجائے جو نقاد ہر صنفِ ادب پر خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں اور جس کے نتیجے میں ان کی تنقیدوں میں گہرائی و گیرائی کا فقدان نظر آتا ہے ان پر بھی پاشا صاحب طنز کرتے ہیں۔یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''اردو ادب میں کامیاب ناقد اسے کہا جاتا ہے جو ہر کمیٹی کا ممبر ہوتا ہے۔جس کی پارٹی بہت تگڑی ہوتی ہے۔اردو کا نقشا محمد شاہ رنگیلے کی دلی اور اس کے حال احوال سے بہت ملتا جلتا ہے۔وہی دن رات کی جوڑ توڑ، عظمت کے لمبے لمبے سفر، کانفرنسیں، سیمنار، سمپوزیم اس کے لیے کوٹھی، کار، ٹیلی فون، خدمت گار تو فراہم کر دیتے ہیں مگر پڑھنے کیا لکھنے تک کے واسطے اس کے پاس کوئی وقت نہیں رہ

جاتا۔ وہ کانفرنسوں میں بڑی تالیوں کے بعد معذرت کے ساتھ اپنا ادھورا مضمون سناتا ہے جو اسی موضوع پر انگریزی یا ہندی کی کسی کتاب سے تقریباً سرقہ ہوتا ہے مگر داخلِ نصاب ہونے کے باعث عرصہ تک طلبہ کا علم اس سے گھٹتا ہی رہتا ہے......بیش تر تنقیدی مضامین اس قدر سرسری اور تشنہ ہوتے ہیں کہ انھیں صحافتی کاوش تک قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جب ناقد ادب کے ہر چوراہے پر ٹریفک کانسٹبل بن کر کھڑا ہوجائے تو اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے''۔۴۲

اس طرح دیکھا جائے تو احمد جمال پاشا کے تنقیدی مضامین کا اسلوب ان کی ظرافت نگاری کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔تنقید میں یہ شے کس حد تک گوارا ہے، یہ ایک الگ بحث ہے۔

احمد جمال پاشا کی تنقید نگاری کے مجموعی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے خلوص کے ساتھ اس وادی میں قدم رکھا۔ وہ خود ایک اچھے ظرافت نگار تھے۔لہٰذا ظرافت کے اسرار و رموز کو بہتر ڈھنگ سے سمجھتے تھے اس لیے ظرافت پر اپنے ہر مضمون میں انھوں نے کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور پیش کیا ہے۔ان کی کتاب ''ظرافت اور تنقید'' جسے پاشا صاحب ''اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب پر پہلا تنقیدی مجموعہ'' کہتے تھے، پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر حنفی نے صحیح کہا ہے کہ ''ہر جگہ انھوں نے بنیادی اور پتے کی باتیں کہی ہیں اور اکثر اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں...... بڑی بات یہ ہے کہ ایسے مقالات میں صاحبِ مضمون جس طرح سے تعصّبات اور معاصرانہ جانب داریوں کا شکار اکثر ہوجاتے ہیں، احمد جمال پاشا اس سے دامن بچالے گئے ہیں''۔۴۳

پاشا صاحب نے ظرافت سے متعلق بہت سی غلط بیانیوں کا ازالہ کیا۔اس صنف سے نقادوں کی بے توجہی کی جانب توجہ مبذول کرائی۔صرف بندھے ٹکے موضوعات پر قلم اٹھانے کے بجائے ظرافت کے نئے گوشوں کو اجاگر کیا اور فکر انگیز مقالے لکھے۔ظرافت کے اجتماعی جائزے میں مشہور اور معروف فن کاروں کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ان کی تنقید سے ان کے مطالعے اور نظر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کی تنقیدوں میں تنگ نظری یا تعصب کا عمل دخل نہیں۔ وہ مروّت کا شکار ضرور ہوئے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔انھوں نے اصولوں کی ڈگر پر چلنے کی کوشش کی۔ دوسروں کی خامیوں کے علاوہ ان کی خوبیوں کو بھی جی بھر کر سراہا۔اپنی باتیں صاف اور واضح انداز میں کہیں۔ان کی نثر

اکھڑی اکھڑی اور روکھی پھیکی نہیں۔ واضح اور دوٹوک ہونے کے باوجود اس میں ادبی چاشنی موجود ہے لیکن ایسی ادبیت نہیں جسے رشید حسن خاں ''پرفریب انداز'' کہتے ہیں۔

چوں کہ احمد جمال پاشا کی تنقید میں کمزوریاں موجود ہیں اس لیے ان کی تمام باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کے بجائے ذہانت کی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی لیکن اتنی بات طے ہے کہ اردو کے مزاحیہ ادب پر تنقید کا جب بھی تذکرہ ہوگا وہاں احمد جمال پاشا کی تحریروں کا ذکر احترام سے ہوگا۔

حواشی

۱۔ اردو ظرافت پر تنقید کا مسئلہ۔احمد جمال پاشا (''آمد'' پٹنہ، اپریل۔جون ۲۰۱۲ء ص ۹۹)

۲۔ ضربِ کلیم سے ضیائے کلیم تک۔احمد جمال پاشا۔''کتاب نما'' دہلی جنوری ۱۹۸۹ء ص ۱۰۵

۳۔ ظرافت اور تنقید۔احمد جمال پاشا۔پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سیوان ۱۹۸۲ء ص ۹۔۱۰

۴۔ ظرافت اور تنقید ص ۱۴۔۱۵۔

۵۔ ظرافت اور تنقید ص ۴۹۔۵۰۔

۶۔ ضلع جگت کا فن۔احمد جمال پاشا نیا دور لکھنؤ یادِ رفتگاں نمبر حصہ اول اپریل۔ستمبر ۱۹۸۸ء ص ۱۳۹۔۱۴۰)

۷۔ انتخاب مضامینِ چکبست۔مرتبہ ڈاکٹر حکیم چندنیّر، اتّر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء ص ۱۹

۸۔ ظرافت اور تنقید ص۔۱۳۶

۹۔ اودھ پنچ لکھنؤ کی طنز و ظرافت انیسویں صدی عیسوی کے دوران۔''ادراک'' گوپال پور جنوری۔مارچ ۲۰۰۱ء۔ص ۹

۱۰۔ ایضاً ص ۸۔۹

۱۱۔ اردو میں طنز و مزاح آزادی کے بعد۔احمد جمال پاشا ماہنامہ ''ہما'' دہلی جنوری ۱۹۸۶ء ص ۹۸

۱۲۔ ہجویاتِ میر۔احمد جمال پاشا پنچ پبلشرز۔سروری منزل کچّا احاطہ لکھنؤ ۱۹۶۷ء ص ۱۶

۱۳۔ ظرافت اور تنقید ص ۱۳۸

۱۴۔ اردو کے پانچ مزاحیہ شاعر۔احمد جمال پاشا۔شفاعت بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۶ء ص ۱۹۔۲۰

۱۵۔ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ خواجہ عبدالغفور۔''معیار و تحقیق'' پٹنہ شمارہ ۲ ۱۹۹۱ء ص ۳۳

۱۶۔ نظر برنی، طنز اور تحریف کا منفرد شاعر۔احمد جمال پاشا (غیر مطبوعہ)

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ کف گیر۔نظر برنی۔ادبی سنگم جامعہ نگر نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۱۹،۲۱،۹۶

۱۹۔ ظرافت اور تنقید ص ۱۱۶

۲۰۔ اردو کی مزاحیہ صحافت۔احمد جمال پاشا (غیر مطبوعہ)

۲۱۔ اودھ پنچ لکھنؤ کی طنز و ظرافت انیسویں صدی عیسوی کے دوران۔''ادراک'' گوپال پور ص ۲

۲۲۔ اختر شاہنشاہی۔اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف مطبع اختر پریس لکھنؤ ۱۸۸۸ء ص ۲۵۱

۲۳۔ صحافت پاکستان و ہند میں۔عبد السلام خورشید مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۶۳ء ص ۲۳۴۔۳۵

۲۴۔ ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔محمد عتیق صدیقی۔انجمن ترقیِ اردو علی گڑھ ۱۹۵۷ء ص ۴۵۷

۲۵۔ اردو صحافت کی تاریخ۔نادر علی خاں۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۷ء ص ۲۸۲

۲۶۔ ظرافت اور تنقید ص ۶۶۔

۲۷۔ نذیر احمد کی ناول نگاری۔ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔دی آرٹ پریس پٹنہ ۶ ۱۹۸۴ء ص ۱۵۶

۲۸۔ ظرافت اور تنقید ص ۶۹

۲۹۔ تاریخِ ادبِ اردو۔رام بابو سکسینہ مترجم مرزا محمد عسکری مطبع منشی نول کشور لکھنؤ دوسرا ایڈیشن سنہ ندارد ص ۱۰۴

۳۰۔ داستان سے افسانے تک۔وقار عظیم۔مکتبۂ الفاظ علی گڑھ ۱۹۸۰ء ص ۷۷

۳۱۔ اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین۔مصباح الحسن قیصر۔نیو یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ ۱۹۷۸ء ص ۱۱۰۔۱۱

۳۲۔ بیسویں صدی میں اردو ناول۔ڈاکٹر یوسف سرمست۔نیشنل بک ڈپو حیدر آباد ۱۹۷۳ء ص ۵۰۔۵۱

۳۳۔ مکتوب کالی داس گپتا رضا بنام احمد جمال پاشا (غیر مطبوعہ) ۲۴ر فروری ۱۹۸۲ء

۳۴۔ ظرافت اور تنقید ص ۱۹۲

۳۵۔ کلیاتِ آتش۔مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی رام نرائن لال بنی مادھو الہ آباد ۱۹۷۲ء ص ۳۵۶

۳۶۔ پنڈت دیا شنکر نسیم اور ان کی مثنوی گلزارِ نسیم۔احمد جمال پاشا ''شیرازہ'' سری نگر مئی ۱۹۶۵ء ص

۳۶۔۳۷

۳۷۔ تلاش و تعبیر۔رشید حسن خاں۔جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۱۹

۳۸۔ گلزارِ نسیم۔مرتب رشید حسن خاں۔انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی ۱۹۹۵ء ص ۲۳۶

۳۹۔ ایضاً ص ۶۸

۴۰۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔کلیم الدین احمد۔بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۱۹۸۳ء ص ۱۰۹

۴۱۔ ضربِ کلیم سے ضیائے کلیم تک۔احمد جمال پاشا ''کتاب نما'' دہلی جنوری ۱۹۸۹ء ص ۱۰۵

۴۲۔ اردو ظرافت پر تنقید کا مسئلہ۔احمد جمال پاشا (سہ ماہی ''آمد''، اپریل۔جون ۲۰۱۲ء ص ۹۴ء ۹۵،۹۷)

۴۳۔ جائزے۔مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۶۸۔

❋

احمد جمال پاشا کی مزاحیہ صحافت : ''اودھ پنچ'' کے حوالے سے

اردوظرافت کی تاریخ میں ''اودھ پنچ'' لکھنؤ کی حیثیت سنگِ میل کی ہے۔سولہ جنوری ۱۸۷۷ءکو منشی سجاد حسین نے اس کا اجرا کیا۔اس مزاحیہ ہفت روزہ نے اردوظرافت کو باضابطہ ایک تحریک کی شکل دی اور منشی سجاد حسین ،عبدالغفور شہباز، تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، اکبرالہ آبادی، احمد علی کسمنڈوی، سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور عبدالکریم برہم وغیرہ کی شکل میں ظرافت نگاروں کا ایک قافلہ تیار کر دیا۔ سجاد حسین اسے ۳۶ برسوں تک نکالتے رہے۔ان کی موت کے تقریباً چار سال بعد حکیم ممتاز حسین عثمانی نے اسے دوبارہ جاری کیا۔ممتاز حسین عثمانی کی رحلت کے بعد ظریف لکھنوی اور پھر سید ظہیر حیدر عثمانی اسے ایک برس تک کسی نہ کسی طرح نکالتے رہے۔آخر کار اس کا دورِ ثانی کم و بیش انیس برسوں کے بعد اختتام کو پہنچا۔

احمد جمال پاشا جب علی گڑھ سے ایم۔اے کرنے کے بعد لکھنؤ واپس آئے تو انھوں نے اپنے دوست ڈاکٹر قمر رئیس کے مشورے سے ''اوودھ پنچ'' کے مردہ جسم میں ایک بار پھر روح پھونکنے کی کوشش کی۔ستمبر ۱۹۵۹ء میں اس کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔یہ ''اوودھ پنچ'' کا تیسرا دور تھا۔''ہماری زبان'' علی گڑھ (۱۵/ستمبر ۵۹ء) کی اطلاع کے مطابق یکم ستمبر ۱۹۵۹ء کو لکھنؤ میں ایک ادبی اجتماع کے موقع پر پروفیسر احتشام حسین نے تیسرے دور کا افتتاح کیا۔جلسے کی صدارت علی عباس حسینی نے کی۔

اپنے تیسرے دور میں ''اودھ پنچ'' کل تیرہ شمارے نکل کر بند ہو گیا۔اس کے سات شمارے باقاعدگی سے نکلے۔آٹھویں شمارے سے وقت کی پابندی برقرار نہیں رہ سکی۔

تیسرے دور کے ''اودھ پنچ'' کا سائز ۸/۲۰x۳۰ اور صفحات کی تعداد چوبیس تھی۔چوتھے شمارے سے صفحات تیس اور آٹھویں شمارے سے چالیس ہو گئے۔بارھویں اور تیرھویں شمارے کنھیالال کپور نمبر تھے جن کے

صفحات کی مجموعی تعداد ۱۴۴ تھی۔ہفتہ وار ''ہماری زبان'' علی گڑھ میں (۲۲/ستمبر ۵۹ء) ''اودھ پنچ'' کے پہلے شمارے پر وارث کرمانی نے تبصرہ کرتے ہوئے اس کے معیار سے بے اطمینانی کا اظہار کیا اور کچھ مشورے دیے۔اس تبصرے کے بعد ''ہماری زبان'' کے ہی مختلف شماروں میں پرچے کی مخالفت اور حمایت میں کئی لوگوں نے کھل کر لکھا۔اطہر پرویز (۸/نومبر ۵۹ء) اور س۔ح۔م بلگرامی (۸/دسمبر ۵۹ء) مخالفین میں تھے جب کہ ایم۔حبیب خاں (۸/نومبر ۵۹ء)، رشیدالدین (۸/ستمبر ۵۹ء) اور تمکین کاظمی (یکم جنوری ۱۹۶۰ء) نے مخالفین کا جواب دیا۔احمد جمال پاشا نے اس بحث سے خود کو الگ رکھا۔

اس دور میں ایڈیٹر احمد جمال پاشا کے علاوہ وقفے وقفے سے معاونین کے طور پر آفتاب اختر، وقار پاشا، شوکت عمر، محمد شعیب رضوی، ساجد صدیقی، والی آسی اور سیٹھ مبین الدین کے نام نظر آتے ہیں۔ گیارھویں سے تیرھویں شمارے تک بہ طورِ سرپرست ایم۔اے لاری کا نام بھی شائع ہوتا رہا۔پرچے کا ماہانہ چندہ پانچ آنے تھا۔آخر میں اس کی ماہانہ قیمت پچاس پیسے اور سالانہ دس روپے ہو گئی۔یہ سرفراز قومی پریس نادان محل لکھنؤ سے طبع ہوتا اور اس کا دفتر سروری منزل کچا احاطہ امین آباد لکھنؤ تھا۔

پہلے شمارے کے اداریے میں مدیر (سرپنچ) نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''اودھ پنچ'' کا حقہ پانی اس سے پہلے دوبارہ بند ہو چکا ہے۔مستوں اور بے فکروں نے دونوں بار زندہ دلی سے اس کی برادری میں خود کو شامل کیا تھا اور روتی صورتوں نے ٹاٹ باہر۔تیسری بار ہم اس کے نکالنے اور آپ اس کے بند کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ہم نے 'اودھ پنچ' آپ کے لیے نکالا ہے۔آپ اس میں جو پسند کریں گے وہ رہے گا اور جو ناپسند کریں گے وہ نہیں رہے گا...... برادری کے ساتھ ساتھ ہم اودھ پنچ کے صفحات اور دل چسپیاں بھی بڑھاتے رہیں گے تاکہ برادری والے سر اٹھا کر کہہ سکیں کہ 'اودھ پنچ' ہی ایک ایسا رسالہ ہے جسے بیک وقت مائیں، بہنیں، بیٹیاں، والدین، سہیلیاں اور دوست پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ہمیں ذاتی طور پر افسوس ہے کہ ہم کبھی کوئی ایسی چیز نہ پیش کر سکیں گے جو راتوں کی نیند حرام کر دے۔تنہائیوں میں چھپ چھپ کر پڑھی جا سکے۔ ہمارا کام آپ کو رلانا اور سنسنی خیز کرنا نہیں بلکہ ہنسانا، گدگدانا اور چٹکیاں لینا ہوگا''۔

اپنے اعلان کے مطابق 'اودھ پنچ' نے سنسنی خیزی سے پرہیز کیا اور ہمیشہ اعلا معیار کی چیزیں

پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ معیار اس وجہ سے برقرار رہا کہ اسے اپنے وقت کے بہترین لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا۔ نثر میں کنھیا لال کپور، کرشن چندر، فکر تونسوی، شفیق الرحمٰن، شوکت تھانوی، یوسف ناظم، وزیر آغا، فرقت کاکوروی، عطیہ پروین، عابد سہیل، باقر مہدی، وقار پاشا اور رشید الدین کے نام اہم ہیں۔ شاعروں میں شوکت تھانوی، رضا نقوی واہی، راجا مہدی علی خاں، سید ضمیر جعفری، شاد عارفی، اختر انصاری، اسد ملتانی، رئیس امروہوی، خفاش کرمانی، ماچس لکھنوی، شوق بہرائچی، دلاور فگار اور آفتاب لکھنوی وغیرہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ دسویں شمارے کے اندرونی سرورق کے نیچے یہ سطر تحریر ہے:

''اردو کا اکلوتا، قدیمی، تاریخی، ضدّی، علمی، ادبی بلند پایہ طنزیہ و مزاحیہ ادبی ماہنامہ''۔

'اودھ پنچ' کے اداریے کا عنوان 'پنچ نامہ' تھا۔ اداریہ عموماً سنجیدہ ہوتا مگر کبھی کبھی چٹکیاں بھی لیتا تھا۔ کبھی پرچہ تاخیر سے شائع ہونے کے باعث تاخیر کے اسباب کا بھی مذاق اڑاتا تھا۔ یوں تو ابتدا ہی سے اس کی مالی حالت اچھی نہیں تھی مگر چند شماروں کے بعد جب حالت مزید خستہ ہوگئی تو ایڈیٹر نے کئی بار اداریوں میں مختلف طریقے سے اس کی شکایت اور مالی مدد کی اپیل کی۔ ایک نمونہ دیکھیے:

''ہمارے بس میں ہو تو ہم آپ کو مہینے میں دو شمارے بھیج دیں۔ پرچہ تو چار دن میں تیار ہو جاتا ہے۔ مضامین بن بلائے مہمانوں اور بچوں کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ رہی سہی کسر ہم دوسرے رسائل سے سرقہ کر کے بغیر شکریہ ادا کیے پوری کر دیتے ہیں۔ نئے عنوانات اور کالم بلا کسی نوٹس کے دم بھر میں تیار ہو جاتے ہیں مگر نہیں تیار ہو پاتے تو وہ ہیں ہمارے آپ کے نقد علیہ السلام جن کی لفٹ کے بغیر آپ کے اودھ پنچ صاحب اپنے دفتر سے ایک انچ بھی آگے نہیں کھسک پاتے۔ ہم اور آپ لاکھ چاہیں کہ رمضان کے بعد ان کو کچھ موٹا اور خوش نما بنا دیا جائے تا کہ ان کی بھی پرسنالٹی بن جائے، یہ کچھ کچھ کارٹون ہو جائیں اور کچھ چمکیلے نکل آئیں مگر صاحب توبہ کیجیے، یہ ضعف کہیں روزوں کا تو نہیں یہ تو سراسر فاقوں کے مارے معلوم ہوتے ہیں۔ اب یا تو انھیں فاقہ مست رہنے دیا جائے، یہ جب چاہیں نکل آئیں اور جب تک چاہیں روپوش رہیں اور ہم آپ قابلِ رشک پڑوسیوں کی طرح ان پر انگلیاں بھی نہ اٹھائیں یا پھر ہم آپ سب مل کر ان کی ہستی کو بنانے کا ذمّہ لیں جو کہ ہر خدائی فوجدار کا اخلاقی فرض ہے''۔

اس کے ایک کالم کا عنوان 'اوٹ پٹانگ' تھا جسے احمد جمال پاشا 'بچھو بیگ' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ اس کالم میں حالاتِ حاضرہ پر مختصر انداز میں بڑی شوخی سے نیش زنی کی جاتی۔ ایک کالم 'برادری' بھی تھا جس کے تحت پاشا صاحب کسی ظرافت نگار کا مرقع پیش کرتے تھے۔ اس رسالے میں فہرستِ مضامین کی سرخیوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شعری حصے کا عنوان کبھی 'منظومات' ہوتا، کبھی 'دکھتی رگیں' اور کبھی 'کوا گہار'۔ مضامین کے لیے ''پھلجھڑیاں'' اور انتخابات کے لیے ''قصائی باڑہ'' کا عنوان بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کئی شمارے میں قارئین اور مشاہیر کے خطوط ''ذاتیات'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

''اودھ پنچ'' کے چند شماروں میں ایک صفحہ 'پنچ اخبار' کے لیے مخصوص تھا جس میں تازہ ترین ادبی وسیاسی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ خبروں میں جا بجا طنزیہ انداز کارفرما رہتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں گومتی ندی میں سیلاب آنے کی وجہ سے لکھنؤ بھی اس کی زد میں آیا۔ 'اودھ پنچ' نے نومبر ۱۹۶۰ء میں اس کی خبر دیتے ہوئے 'پنچ اخبار' کا 'طوفانِ نوح ایڈیشن' شائع کیا۔ سیلاب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے 'جہیز کا سامان' کے عنوان سے یہ اطلاع بھی فراہم کی ''جہاں بھوک پیاس سے بے چین معصوم بچے اور بیوائیں مدد کے لیے چیخ رہی تھیں وہاں امدادی کشتیاں ایک خدا ترس وزیر کا سامان اور مسہریاں پہنچانے میں مشغول تھیں''۔

اخبار کے کالم میں دوست احباب سے چھیڑ چھاڑ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ حسن کمال نے فروری ۱۹۶۱ء کے شمارے میں یہ اشتہار شائع کرایا:

''تلاش ہے کسی ایسے صاحب کی جو ۳۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں فرسٹ ایر آرٹس کے طالبِ علم تھے اور آفتاب ہال میں رہتے تھے۔ مقصدِ ملاقات یہ تصدیق کرنا ہے کہ میرے والدین اتنے ہی ذہین اور ہر فن مولا تھے جتنا وہ ہم سے بیان کرتے ہیں''

''اودھ پنچ'' نے ہزلیات کا معیار بلند کرنے کی بہت کوشش کی۔ ہزلوں کا معیار طے کرنے اور رسالے میں انھیں جگہ دی جائے یا نہیں اس کے لیے اس نے قارئین کی رائیں طلب کیں پھر ان کے پیشِ نظر ہزلوں کے معیاری نمونے پیش کر کے ہزل گو شعرا کے لیے گائڈ لائن فراہم کی۔ اکتوبر نومبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں جہاں ہزلوں کا انتخاب شائع ہوا ہے وہاں حاشیے میں یہ نوٹ بھی ملتا ہے کہ ''اگر کچھ مزاحیہ شاعر زندہ ہوں تو براہِ کرم اپنی نگارشات ہم کو ارسال کریں''۔

احمد جمال پاشا نے جو کچھ لکھا نثر میں لکھا لیکن فروری ۱۹۶۱ء کا شمارہ اس لحاظ سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں پاشا صاحب ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ صفحہ ۳۴ پر ان کے جو

دواشعار شائع ہوئے ہیں انھیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

میونسپل بورڈ سے اب کارپوریشن بنا لیکن
وہ لاپرواہی بھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
ابھی تک لوگ کوڑا پھینکتے ہیں راہ گیروں پر
'وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے'

''اودھ پنچ'' نے اپنی کل اشاعتوں میں دو خاص نمبر نکالے۔نومبر ۱۹۵۹ء کا شمارہ الکشن نمبر تھا۔ اس کے آخری دو شمارے کنھیا لال کپور نمبر تھے۔ان خاص نمبروں میں کپور نمبر اپنی اہمیت وافادیت کے لحاظ سے ایک بیش قیمت ادبی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ کپور پر پہلا نمبر تھا جو ان کی زندگی میں نکلا۔اس میں کپور کی شخصیت اور فن پر سید احتشام حسین، وزیر آغا، شارب ردولوی، محمود الحسن رضوی، صغیرہ نسیم، حسن کمال، ذکی کاکوروی، فکر تونسوی، تخلص بھوپالی، اختر بستوی اور احمد وصی نے مضامین لکھے۔خود کنھیا لال کپور نے ایک طویل مکتوب میں اپنی شخصیت اور فکر وفن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ کپور پر تحقیقی مقالہ لکھتے وقت اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اس نمبر میں احمد جمال پاشا کی شاہکار پیروڈی '' کپور۔ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' بھی شامل ہے جس میں انھوں نے کپور کی آڑ لے کر مختلف نقادوں کی طرزِ تحریر کے خاکے اڑائے ہیں۔اس میں کنھیا لال کپور کے مضامین کا نمائندہ انتخاب بھی شامل ہے۔ کپور کے ایک مضمون ''صداقت'' کا فارسی ترجمہ پروفیسر سید حسن نے کیا تھا جو اس نمبر میں موجود ہے۔

مدیر ''اودھ پنچ'' نے کپور نمبر کے علاوہ رشید احمد صدیقی نمبر، ہزل نمبر، بہترین ادب نمبر اور ۱۹۶۱ء کا بہترین ادب نمبر پیش کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن ان میں سے کوئی نمبر نہیں نکل سکا۔البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ احمد جمال پاشا نے ۶۱ء کا بہترین ادب کے بدلے ۱۹۶۲ء کا بہترین طنزیہ ومزاحیہ نمبر ترتیب دیا جو ۲۳/مارچ ۱۹۶۳ء کو ''نمک دان'' کراچی کے سالنامے کے طور پر شائع ہوا۔

''اودھ پنچ'' میں پابندی سے نہ سہی مگر کبھی کبھی کارٹون بھی شائع کیے جاتے تھے جن میں سیاست یا معاشرے کے کسی مضحک پہلو کی عکاسی کی جاتی تھی۔ کنھیا لال کپور نہایت دبلے پتلے اور دراز قد شخص تھے۔اودھ پنچ کے کپور نمبر میں سرورق پر ان کا بہترین کارٹون شائع کیا گیا ہے جس میں کپور کوٹ پینٹ پہنے ہوئے قطب مینار کے اوپر کہنی ٹکائے کھڑے ہیں۔ نیچے ایک اونٹ پوری گردن اٹھائے انھیں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کپور نمبر ۲ کے صفحہ ۴ پر یہی کارٹون مکرر چھپا ہے جس میں اونٹ غائب ہے۔اس

کے نیچے سرخی لگائی گئی ہے ''عالمی مقابلۂ حسن میں اودھ پنچ کی پیش کش''۔

اس میں کتابوں اور رسائل پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔تبصرے کی سرخی ''واہ واہ'' تھی۔ ابتدائی چند شماروں میں احمد جمال پاشا نے 'مولوی مدن' کے نام سے تبصرے لکھے۔کبھی مبصر کے نام کی جگہ ''از ادارہ'' لکھا ہوتا یہ تبصرے بھی پاشا صاحب ہی لکھتے تھے۔ بعد میں دوسرے اصحاب مثلاً رام لعل، شارب ردولوی، عابد سہیل، ساجد صدیقی، اقبال مجید، حسن کمال، احراز نقوی، والی آسی وغیرہ بھی اس صف میں شامل ہوگئے۔تبصرے مزاحیہ اور سنجیدہ دونوں طرح کے ہوتے تھے۔دوسرے شمارے کے تبصرے میں احمد جمال پاشا نے ''جاسوسی دنیا'' کی ادبی حیثیت کا سوال اٹھایا اور اس کی زبردست حمایت کی۔''تنویرِ ادب'' از صغیر احمد جان پر والی آسی اور ''ذہن اور انقلاب'' از شہیر حسن پروہی وہانوی (شوکت تھانوی) کے تبصرے بڑے دلچسپ ہیں۔

''اودھ پنچ'' کے بعض شماروں کی ابتدا میں تحریر ہے کہ 'جاری شدہ ۱۹۷۸ء۔ یہ قول درست نہیں۔ اودھ پنچ کا اجرا، جیسا کہ ابتدا میں لکھا جا چکا ہے ۱۸۷۸ء میں نہیں بلکہ ۱۸۷۷ء میں ہوا تھا۔محمد عبدالرزاق فاروقی نے اپنی تصنیف ''اودھ پنچ کی ادبی خدمات'' (اشاعت ۱۹۸۲ء) میں صفحہ ایک سو اکتالیس پر پہلے شمارے (۱۶/جنوری ۱۸۷۷ء) میں شائع شدہ مضامینِ نظم ونثر کی فہرست بھی پیش کردی ہے۔

''اودھ پنچ'' کے تیسرے دور میں پہلے دور والی بات نظر نہیں آتی۔منشی سجاد حسین نے 'اودھ پنچ' کا اجرا انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا تھا جس کا بیش تر حصہ انگریزوں کی پالیسیوں کا مذاق اڑانے میں صرف ہوتا تھا۔سجاد حسین کٹر کانگریسی تھے اور ان کے مزاج میں انتہا پسندی کو خاصا دخل تھا۔انھوں نے ایک متعین پالیسی کے تحت 'اودھ پنچ' کو قوم کا ترجمان بنایا اور اس سے طنز وظرافت کے پردے میں اصلاحِ معاشرت کا کام لیا۔ان کے مقاصد عظیم تھے اور دائرۂ کار وسیع۔ جب کہ تیسرے دور میں اس کا مقصد ظرافت کی ترقی تک محدود تھا لیکن یہ چیز بہرحال قابلِ تعریف ہے کہ اس نے دورِ سوم میں ظرافت کے جو نمونے پیش کیے ان کی اکثریت فن کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔جب کہ دورِ اول میں ہمیں اچھے اور برے ہر طرح کے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

'اودھ پنچ' کا تیسرا دور اپنے بیش قیمت باغ وبہار مضامین اور منظومات کی بنیاد پر ہمیشہ یاد کیا جائے گا اور احمد جمال پاشا کی سلیقہ مندی اور ذہانت کی یاد بھی دلاتا رہے گا۔

❋

انتخابِ نگارشات

ا۔	گلّی ڈنڈے پر سیمنار (مزاحیہ مضمون)	101
۲۔	کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (پیروڈی)	109
۳۔	کلیم الدین احمد (خاکہ)	115
۴۔	فنِ لطیفہ گوئی (تنقید)	124

گلّی ڈنڈے پر سیمنار

سچ پوچھیے تو یہ ''کلجگ''، نہیں ''سیمنار یگ'' ہے۔ اگر ہم اس میں جی رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ کسی نہ کسی سیمنار میں یہ طے کیا جا چکا ہے کہ ''ابھی ہمیں جینے دیا جائے''۔ اگر ہم کھا پی رہے ہیں تو اس بنیاد پر کہ کوئی اہم سیمنار یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ ''نسلِ انسانی کی بقا اس کے کھاتے پیتے رہنے میں ہے''۔ اگر ہم سانس لے رہے ہیں تو صرف اس عالمی سیمنار کے صدقے جس میں بڑی طاقتوں نے یہ قرارداد منظور کر لی تھی کہ ''چونکہ انسانی زندگی میں تسلسل کا ایک پہلو سانس لینے کا عمل بھی ہے اس لیے کوئی ایسا نیوکلیائی بم فی الحال ایک دوسرے پر نہ داغیں جو فضا کی ساری آکسیجن سوخت کر لے اور انسانی سانس کا نظام متاثر ہو کر اس تسلسل کو ختم کر دے جس سے بم داغنے والے بھی متاثر ہو سکتے ہیں جن کی زندگی میں تسلسل امنِ عالم کے لیے ناگزیر ہے''۔

ہم کوئی کاروبار یا روزگار صرف اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ اس کے حق میں متعدد سیمنار ہو چکے ہیں۔ اگرچہ وہ کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکے اور اب بھی مسئلہ زیرِ غور ہے کہ ''آخر گائے بھینس کون سا کاروبار کرتی ہیں جب کہ وہ بھی حضرتِ انسان کی طرح چوپایہ ہیں لیکن فکرِ معاش سے آزاد، ہشاش بشاش، زندہ اور سلامت ہیں۔ الّو اور کوّے کون سا کاروبار یا روزگار کرتے ہیں جبکہ وہ انسان سے زیادہ آرام سے ہیں۔ آدمی سے زیادہ فکر اور عقل رکھتے ہیں۔ پھر فضیلت یہ کہ بشر نہ ہوتے ہوئے بھی اڑ سکتے ہیں جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی خود سے اڑ نہیں پاتا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے اگر انسانی روزگار، کاروبار اور صنعت و حرفت جیسے دھندوں کا حق سلب کر لیا گیا تو حکومتیں روزگار دلانے، دھندے کرانے، بے روزگاروں کے طعنوں اور معاشی بحران سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گی اور دنیا میں کامیاب حکومتوں کا دور شروع ہو جائے گا۔

چندفرسودہ خیال حضرات کے مطابق ''ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ زندگی کی طرح ادب بھی معنویت، ترسیل اور قاری کا محتاج ہے۔ نئے روشن خیال تو عرصہ ہوا، ادب و زندگی یا لفظ و معنی کے فکری بستے نذرِ جزدان کر چکے ہیں لیکن زندگی سے ادب میں سیمنار کی ایسی یلغار ہوئی کہ کیا فرسودہ، کیا روشن، بے عقل مکتبِ فکر تک کو سیمنار ہو گیا ہے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے ایسے ایسے ادبی سیمناروں میں شرکت کی ہے جو آپ کے وہم و خیال میں نہ آسکیں۔ کیونکہ ہم پر ادیب ہونے کی تہمت ہے اس لیے ہمیشہ وقتِ عزیز، روپے اور کوفت کی شکل میں شرکت کا جرمانہ ادا کرنا پڑا اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ'' ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ''۔

مثلاً ''علامہ اقبال بھی کوئی شاعر تھے؟'' سیمنار ادبی انارکسٹوں نے کانکے یا آگرہ میں برپا کیا تھا۔ فاضل مقررین میں اکثریت نومولود شعرا کی تھی۔ کوئی بھی شاعر تین تولے سے زیادہ فکر کا مالک نہ تھا۔ اس محفل کے سارے بالشتیے کوہِ اقبال کو سر پر اٹھانے کے لیے بار بار تال ٹھونکتے اور پچک جاتے۔ علاّمہ اقبال کو سرے سے کسی نے پڑھا ہی نہ تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد علامہ اقبال کا نام سنائی دیتا۔ پھر کامیاب شعرا کے نام گنائے جاتے جو سب کے سب سیمنار میں موجود تھے۔ نام رٹوانے کے باوجود ہم ان میں سے کسی کی بھی شناخت نہ کر سکے۔ ہم اوروں کو کیا کہیں جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ دل ہی دل میں ان سیمناروں سے توبہ کی مگر توبہ کیجیے جب ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت ملی تو راستے ہی سے کچھ ریسرچ اسکالر ہمیں ایک سیمنار میں اغوا کر لے گئے۔

موضوعِ فوجداری تھا ''قاضی عبدالودود ایک دہشت پسند محقق'' شرکا میں قاضی صاحب کے حامیوں اور مخالفوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ ایک قاضی حامی نے مباحثہ شروع ہونے سے پہلے موضوع میں ترمیم چاہی کہ لفظ ''دہشت پسند'' کو ''سخت گیر'' سے بدل دیا جائے۔ ایک دوسرے حامی نے جو کہ ان کا بہت ہی حامی تھا ''سخت گیر'' کو ''با اصول'' میں تبدیل کیے جانے کے لیے علمی، ادبی روایات کے واسطے دیے۔ اس پر ایک مخالف نے آوازہ کسا۔ ''اگر موضوع ''قاضی عبدالودود اردو تحقیق کے ملک الموت'' کر دیا جائے تو اس میں سارے پہلو آجائیں گے''۔ اس فقرے نے بارود کو فلیتہ دکھانے کا کام انجام دیا تھا۔ قاضی حامیوں اور مخالفوں نے دلیلوں کے بجائے کرسیوں اور اسٹولوں کا آزادانہ استعمال کیا۔ میز کے نیچے ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر وحید قریشی اور دوسرے امن پسندوں کے ساتھ دل ہی دل میں سیمنار کے غیر

جمہوری طرزِ عمل پر احتجاج کرتے اور اس وقت تک آیۃ الکرسی پڑھتے رہے جب تک کہ پولیس کی سیٹیاں اور اہلِ سیمنار کے ہال سے بھرّا مار کر نکل جانے کی دل خوش کن آوازیں ختم نہ ہو گئیں۔

اس پر ہمیں وہ تاریخی سیمنار یاد آ گیا جس کا موضوع تھا۔ ''اردو تنقید میں کلیم الدین احمد کا قتلِ عام'' اس سیمنار میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمام مقتولین جمع کیے گئے تھے۔ سید احتشام حسین مرحوم خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جب بولنے کھڑے ہوئے تو انھیں اپنا قتل یاد آ گیا۔ شدتِ غم سے وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اس لیے بھی نہ کچھ بول پائے کہ انھوں نے کبھی کسی کی مخالفت میں کچھ نہ کہا تھا۔ مگر جب مجنوں گورکھپوری کھڑے ہوئے تو ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ پہلے انھوں نے اپنے دفاع میں دو ہزار فارسی اشعار کرسی پر کھڑے ہو کر سنائے پھر پانچ ہزار اردو اشعار میز پر کھڑے ہو کر سنائے۔ منتظمین نے انھیں اس خوف سے بٹھا دیا کہ سیمنار کہیں مشاعرے میں نہ تبدیل ہو جائے۔ علی عباس حسینی مرحوم کھڑے ہوئے مگر بیدِ مجنوں کی طرح غصّے سے لرز رہے تھے جو منھ میں آیا کہہ گزرے اور اتنا کہا کہ کوئی کچھ سمجھ نہ سکا۔ آلِ احمد سرور نے آ کر مجمع کو سنبھالا اور ''ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی'' پر اصرار کے ساتھ انھوں نے سمجھایا کہ ''کلیم الدین احمد کے یہاں پسی ہوئی بجلیاں ہیں جن سے وہ کوئی آئینہ تو نہ بنا سکے مگر آئینہ، آئینہ کر دیا۔ انھوں نے اردو تنقید کا قتلِ عام کیا بھی اور نہیں بھی کیا۔ ان کی سفّاکی میں حسن ہے اور حسن میں سفّاکی ہے''۔ ابھی سرور اپنے تنقیدی میزان کے دونوں پلڑے برابر بھی نہ کر پائے تھے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی تن تنا کر کھڑے ہو گئے اور بولے ''صاحبو! ان کو پہچان لیجیے! یہ سیمنار کو نہ ضیائے کلیم سے ضربِ کلیم تک پہنچنے دیں گے نہ ضربِ کلیم سے ضیائے کلیم تک۔ ان کے اس رکابی رویّے کی طرف سب سے پہلے میں نے اس اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میرا یہ مقالہ آج سے بیس سال پہلے رسالہ ''نقوش'' لاہور کے ''کلیم الدین احمد نمبر'' میں پہلے نمبر پر چھپا تھا۔ اس میں بڑے بڑے لکھنے والے تھے مگر اولیت کا شرف صرف مجھے ہی حاصل ہوا تھا اور ''نقوش'' میں محمد طفیل صاحب نے میری بہت بڑی ''غیر شرعی تصویر'' سے میرا مضمون شروع کیا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے ص ۱۱ سے میرا مضمون بائیں طرف سے شروع ہوا تھا۔ اس شاندار تصویر کے نیچے ''دگر دانائے راز آید'' بڑے بڑے موٹے حروف میں چمک رہا تھا۔ کسی نے چلاّ کر پوچھا۔ آخر آپ کلیم صاحب کی حمایت میں بولنا چاہتے ہیں یا اپنی ....؟ ڈاکٹر عبدالمغنی نے کہا ''افسوس کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کے پیشِ نظر میں چاہوں گا کہ محمد حسن عسکری صاحب تشریف

لائیں۔

عسکری مرحوم تشریف تو لے آئے مگر دلہنوں سے کچھ زیادہ ہی شرمارہے تھے۔ انھوں نے فرانسیسی میں کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ غش کھا کر گرے تو منتظمین انھیں لاد کر لے گئے۔ مجمع فیصلہ نہ کرسکا کہ یہ کیفیت شدتِ غم سے تعلق رکھتی ہے یا انتہائے شرم سے۔ غرض احتجاجی سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ شکر ہے کہ نظم وضبط آخر تک برقرار رہا۔

اگر ادب سے زندگی کی جانب واپس جایئے تو معلوم ہوگا کہ آپ کے ہر طرف سیمنار ہورہے ہیں کہیں مقامی ''انجمنِ تجہیز وتکفین'' کا سیمنار، ''مردوں کے مسائل'' پر ہورہا ہے تو کہیں ''مچھلیوں کی جنسی سرگرمیوں کے اثرات غذائے انسانی پر'' دھواں دھار تقریریں ہورہی ہیں کہ ''نہ مچھلیاں ہوتیں اور نہ ہم ہوتے'' ۔ایک طبی سیمنار جس میں ڈاکٹر کم اور کمپاونڈر زیادہ تھے اس اہم مسئلہ پر تھا کہ ''ناک کے بائیں نتھنے کے بالائی حصے پر گرد کے ذرّات روکنے والے بالوں کی اوسط تعداد استوائی ممالک میں'' چونکہ ہمیں سخت زکام تھا اور ہمارا بایاں کیا، داہنا نتھنا تک بند تھا دوسرے ہم ڈاکٹر کیا کمپاونڈر تک نہ تھے اس لیے خاموشی سے پسپا ہوگئے۔ آپ پوچھیے گا ''آپ آخر وہاں مرنے کے لیے گئے کیوں تھے؟ تو عرض کروں گا کہ ''دراصل گیا تو ٹھیک تھا، بس ذرا جمعرات اور جمعہ حساب کی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ مجھے دعوت نامہ ملا تھا ''شاگردانِ جمیل مظہری کی اصل تعداد سیمنار'' کا جو جمعہ کا مبارک دن تھا۔ دل چسپی یہ تھی کہ بہت سے ''دل بدلی'' کے اسکنڈل سامنے آئیں گے۔ بہتوں کی قلعی کھُلے یا کھِلے گی۔ بدقسمتی سے ہم جس کو جمعہ سمجھ رہے تھے وہ فقط جمعرات تھی۔

سیاسی سیمنار کم دل چسپ نہیں ہوتے۔ ایک سیاسی سیمنار کی صدارت کا شرف ہمیں اس لیے حاصل ہے کہ سیمنار کے کنوینر صاحب ہمارے شاگردِ رشید تھے اور ہمیں صدارت کی چھوٹی سی رشوت دے کر ہم سے بہت سے نمبر وصول کرنا چاہتے تھے۔ تو جناب سیمنار تھا ''جلسہ جلوس اور بلوے فساد کے لیے کرایے کے رضا کاروں کی قومی فہرست سازی کے مسائل'' ہم مسندِ صدارت پر اکڑے، بیٹھے، سوتے رہے اور ہر مسئلہ کی طرح یہ مسئلہ بھی حل ہوتا رہا۔ ہم اتنے کامیاب صدر ثابت ہوئے کہ اگلے ہی دن ہمیں ''بکری کی مینگنی اور غیر ملکی مبادلۂ زر'' سیمنار کی صدارت پیش کی گئی۔ ماہرینِ معاشیات نے اس دولتِ خداداد کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ بے اختیار ہمارا دل چاہا کہ کرسیِ صدارت چھوڑ کر بکری کی مینگنیوں کی تلاش میں نکل جائیں اور چند ہفتوں میں نہ صرف انھیں دوسرے ملکوں کو بھیج کر لکھ پتی ہوجائیں بلکہ ملکی معاشی حالت بھی غیر ملکی مبادلۂ زر کا ڈھیر لگا کر مستحکم

کردیں۔

ہم درس وتدریس کے مردِ میدان ہیں یہ بات ہم نے صرف اس لیے کہی ہے کہ پڑھنے اور پڑھانے کے میدان میں فی زمانہ دونوں نظر نہیں آتے نہ پڑھنے والے نہ پڑھانے والے۔ اس کے باوجود اب تک یہ میدان ہم نے چھوڑا نہیں ہے۔ میدان میں کوئی نظر کیسے آئے۔ سب تو سیمنار میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی ''بین اقوامی نصاب تعلیم میں ہم آہنگی'' پر سیمنار ہورہا ہے، تو کبھی ''استاد شاگرد تعلقات مہابھارت میں'' پر۔ اب جو فاضل مقرر آتا ہے وہ قدیم ہندستان میں ڈوب جاتا ہے۔ دورِ حاضر کی مہابھارت میں کوئی ابھرتا ہی نہیں۔ نہ یہ بتاتا ہے کہ ''تعلقات کہاں اب تو صرف مہابھارت رہ گئی ہے'' ہم نے یونیورسٹی میں ایسے سنسنی خیز سیمنار بھی دیکھے ہیں جن میں سڑک کے اس پار ''استاد کی پٹائی میں شاگردوں کا حصہ'' پر سیمنار ہورہا ہے اور سڑک کے اس پار ''شاگرد کی پٹائی میں استاد کا حصہ'' پر سنجیدگی سے غور کیا جارہا ہے اور یہ بھی دیکھا جارہا ہے کہ ''طلبہ کے حقوق'' سیمنار میں ''لڑکیاں چھیڑنے، اساتذہ پر آوازیں کسنے اور بلا امتحان کے فرسٹ ڈویژن'' جیسے سنجیدہ مطالبات کیے جارہے ہیں جن کا لڑکوں کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔

ہمارے گھر کے برابر ایک پبلک ہال ہے جو میڈیکل کالج سے بہت نزدیک ہے۔ اس لیے اس میں طبّی سیمنار بہت ہوتے ہیں جن کی کارروائی براہِ راست ہال لاؤڈ اسپیکروں سے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ سب سے زیادہ طبّی سیمنار ''کینسر'' پر ہوتے ہیں۔ جیسے ''سگریٹ پینے سے کینسر''، سگریٹ نہ پینے سے کینسر''، ''مسکرانے سے کینسر''، ''کھانسی سے کینسر''، ''چھینکنے سے کینسر''، ''ناشتہ کرنے سے کینسر''، ''کھانا کھانے سے کینسر''، ''سونے سے کینسر''، ''جاگنے سے کینسر''، ''غصّے سے کینسر''، ''ہنسنے سے کینسر''، ''شادی سے کینسر''، ''رشتہ داروں سے کینسر''، ''پڑوسیوں سے کینسر''، ''شکر سے کینسر''، ''نمک سے کینسر''، ''پیدا ہونے سے کینسر''، ''مرنے سے کینسر''۔ ڈاکٹر جس طرح کینسر کے اسباب بیان کرتے ہیں فوراً سمجھ میں آجاتے ہیں اور ہم اسباب چھوڑ دیتے ہیں۔ چاہے وہ ہمیں نہ چھوڑیں۔ مگر باوجود سخت کوشش کے اب تک ہم پانی پینے، مسکرانے، کھانے، چھینکنے، کھانسنے، سونے، جاگنے، غصّے، ہنسنے، رشتے داروں اور پڑوسیوں سے پرہیز پر کوئی قدرت نہ حاصل کرسکے ہیں۔ ہم ''مرنے سے کینسر'' سے بہت ڈرتے ہیں۔ مرنے کے بعد اگر قبر میں خدانخواستہ کینسر ہوگیا تو پھر کیا ہوگا؟ مگر اس سے بچنے کا کوئی نسخہ ابھی تک ہمیں دستیاب نہ ہوسکا۔

ہمارا ارادہ ہے کہ ''کینسر کے فن'' پر ایک مستقل کتاب لکھیں اور ثابت کردیں کہ ''کینسر نہ پرہیز سے

ہوتا ہے اور نہ علاج سے بلکہ کینسر صرف کینسر سے ہوتا ہے اور وہ بھی صرف ہونے والے کو۔ کینسر نہ تیمار دار کو ہوتا ہے نہ اغیار کو بلکہ مریض سے زیادہ ڈاکٹر کو ہوتا ہے اور وہ بھی مرض کم مالیخولیا زیادہ۔

ہم نے بتایا تھا کہ ''بے حد کامیاب، صدر ثابت ہونے کی وجہ سے اکثر ایسے سیمناروں کے صدر بنا دیے جاتے ہیں جن سے صحیح سلامت واپسی تقریباً غازی کا درجہ رکھتی ہے اور تعجب اس پر ہوتا ہے کہ شہادت کیوں نہ پائی۔ چنانچہ ہمیں ایک تعلیمی سیمنار کی صدارت کا شرف حاصل ہوا جس کو یونیورسٹی کے علماء وفضلاء نے برپا کیا تھا اور عالمی ادارۂ صحت کے زیرِ اہتمام اسے منایا جا رہا تھا۔ سیمنار کا موضوع تھا ''گلی ڈنڈے پر سیمنار''۔

سیمنار میں گلّی ڈنڈے کو فروغ دے کر قومی بلکہ بین الاقوامی کھیل قرار دے کر عالمی صحت بچا لینے اور قوم کا وقار بلند کر دینے کے ترقیاتی پہلوؤں پر دھواں دھار روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ سیمنار کا ایک روشن رخ یہ بھی تھا کہ ''اگر گلّی ڈنڈے کا اولمپک میں داخلہ ہو گیا تو ایک سونے کا تمغہ کہیں نہیں گیا''۔

اس میں سیمنار کم اور ڈنڈے زیادہ تھے۔ کچھ گلیاں بھی تھیں۔ ہم سیمنار میں ہمت کا لنگوٹ کس کر اس تیاری سے گئے تھے کہ شاید ہمیں چمپی اور کھڈے کے ہاتھ دکھانا پڑیں یا دور تک پدنا پڑے۔ سیمنار میں اس کثرت سے لیڈر موجود تھے کہ باوجود کوشش کے کسی دانشور کی کوئی دال نہ گل سکی۔ دال کو گلنا کہاں تھا وہ تو جوتیوں میں بٹنی تھی۔

دستور کے مطابق ہر سیمنار کسی نہ کسی موضوع پر ہوتا ہے اور بحث کرنے والے ہمیشہ موضوع سے بہک جاتے ہیں۔ آخر وہ بحث ہی کیا جو موضوع پر ہو اور وہ موضوع کیا جس پر بحث ہو سکے۔ چنانچہ اس تاریخی سیمنار میں بھی بہکنے والے اس پر اتر آئے کہ معلوم ہوتا تھا بحث نہیں کر رہے ہیں گلّی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ کچھ نے گلّی ڈنڈے کی اہمیت جو ربر کی طرح کھینچ کر بڑھانا شروع کی تو یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ ''جس ملک کو بھی دیکھیے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم گلّی ڈنڈا کھیل رہی ہے۔ حکومت سے، مسائل سے، آفات سے۔

''حضرات! تہذیبِ انسانی کا اوّلین گہوارہ گلّی ڈنڈا ہے۔ وہ طفل کیا چلے گا جو گلّی ڈنڈا نہ کھیل سکے''۔ کچھ مقررین نے حسبِ معمول رٹے رٹائے اشعار اور دوسروں سے لکھوائی ہوئی تقریروں کی مدد سے ثابت کیا کہ ''غالبؔ اور اقبالؔ کے یہاں جو درسِ حیات ہے اس میں بہت ہی واضح اشارے اس کھیل کے ملتے ہیں

جن پر افسوس کہ ملک وقوم نے اب تک توجہ نہیں کی ہے۔ گلّی ڈنڈا کھیلنے والے کو اقبال کے بچۂ شاہیں سے تشبیہ دی گئی اور ایسی تالیاں بجیں کہ ہال گونج اٹھا۔

فلسفۂ جدید کے ایک عالم جو ترسیل کے المیے کے مدح خواں اور علامتوں کے بوجھ بجھکڑ ہیں فرمایا ''گلّی دراصل عام آدمی اور ڈنڈا لیڈر رہے''۔ اس پر ہال کی اکثریت یعنی لیڈروں نے بہت برا مانا۔

ایک مولانائے محترم نے اپنی نورانی داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے فرمایا ''گلّی تو انسان ہے۔ بنی نوع انسان اور ڈنڈا مشیت ہے۔ یہ کھیل تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ ان شاءاللہ!''

ایک ماہرِ معاشیات نے کہا ''گلّی قیمتیں ہیں اور ڈنڈا اپنیے ہیں جنھوں نے اسے آسمان پر پہنچا دیا ہے''۔

ایک سائنسداں نے کہا ''گلّی ایٹمی توپ خانہ ہے اور ڈنڈا اس کا بٹن ہے''۔

ایک اخبار نویس نے پوچھا ''کہاں ہیں گلّی ڈنڈا کھیلنے والے۔ ان سے میں اپنے اخبار کے لیے خصوصی انٹرویو لے لوں''۔

اس پر سب جھینپ گئے۔ کیونکہ علم اور سیاست کے کھلاڑی تو بہت تھے مگر گلّی ڈنڈا کھیلنا کوئی نہ جانتا تھا۔ اس سیمنار کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ گلّی ڈنڈے کے رمز و ایماء میں زندگی کے سارے پہلو سامنے آ گئے تھے۔ سوائے سیاست کے تاریک پہلوؤں کے، کہ سیاست خود بہ نفسِ نفیس موجود تھی۔ بار بار گلّی ڈنڈے کے ''شو میچ'' کے مطالبے سے دل بلّیوں اُچھلنے لگتا کہ اگر سیمنار کھیل میں تبدیل ہو گیا تو صدر مظلوم کی کیا کیا نہ درگت بنے گی۔ مگر ہر بار کھیل کی قرارداد اس لیے کھٹائی میں پڑ جاتی کہ زیادہ تر لیڈر کھیلنا نہیں جانتے تھے۔ یا گلّی ڈنڈا میچ کا افتتاح کسی نہ کسی وزیر سے کروانا چاہتے تھے۔ ایک مطالبہ جس کو لکھ کر محفوظ کر لیا گیا وہ یہ تھا کہ ''گلّی ڈنڈا سنگِ بنیاد'' وزیر اعلا سے رکھوایا جائے۔ مگر اس پر بھی اتفاق نہ ہو سکا کیونکہ مختلف سیاسی لیڈر مختلف وزرائے اعلا کے نام پیش کر رہے تھے۔ ایک آدھ نے وزیر اعظم یا سابق وزیر اعظم کے اسمِ گرامی بھی پیش کیے مگر اعتراض ہو گیا کہ پہلے منظوری حاصل کرنے کے بعد ہی ان کے نام کا اعلان ہو سکتا ہے۔ کچھ لیڈر جو دوسرے ملکوں کی ہوا کھانے کی تاک میں تھے وہ بار بار ''عالمی ادارۂ صحت'' کے ڈائرکٹر جنرل کا نام پیش کر رہے تھے۔ مگر کہا گیا کہ ''گلّی ڈنڈے کا تعلق'' ادارہ صحت ہی سے نہیں ادارۂ کھیل

کود سے ہے۔'' اس پر تُو تُو ،مَیں مَیں شروع ہوگئی اور ''الفاظ واپس لو'' کا مطالبہ ہونے لگا۔ میں گلّی ڈنڈے کا ''سنگِ بنیاد'' کے عناصرِ ترکیبی پر غور کر رہا تھا۔ اتنے میں ''گلی ڈنڈا عالمیسیمنار'' کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ ایک گروپ ''قومیسیمنار'' پر زور دے رہا تھا، دوسرا ''عالمی سیمنار'' کس سطح پر بلایا جائے؟ اس کو طے کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنادی جائے اور فی الحال سیمنار میں پیش کیے جانے والے مسائل اور مطالبات تیار کیے جائیں گے''۔

اس تجویز کو پسند کیا گیا مگر سب کمیٹی بننے میں دقّت تھی کہ کوئی بھی لیڈر اس پر تیار نہیں ہوسکا کہ 'سب کمیٹی' میں اسے شامل نہ کیا جائے۔ دراصل احتیاطاً پوچھا بھی یہی گیا تھا ''کون کون حضرات سب کمیٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتے وہ ہاتھ اٹھادیں'' مگر ایک نے بھی ہاتھ نہ اٹھا کر گلّی ڈنڈا سیمنار میں بحران پیدا کردیا۔

آخر مجبوراً کثرت رائے سے ایک سب کمیٹی بنادی گئی جس کے پانچ سو بہتّر ممبر تھے۔ ہال میں ۲۸ سابق وزراء بھی موجود تھے جو سب کمیٹی میں شمولیت کو وقار کا سوال بنائے ہوئے تھے مگر بیچارے بری طرح اقلیت میں تھے اور ان کے سابق چمچوں یعنی اکثریت نے بآسانی یہ منظور کرلیا کہ ''کوئی سابق وزیر گلّی ڈنڈا سب کمیٹی میں شامل نہ کیا جائے اس پر غریب سابق وزراء واک آؤٹ کر گئے۔ اس کے بعد مسائل اور مطالبات پر تجاویز کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ''گلّی ڈنڈا داخلِ نصاب کیا جائے'' کسی نے وضاحت چاہی ''داخلِ نصاب یا داخلِ اسپورٹس''؟ اس پر میزیں تھپتھپائی گئیں، گھونسے دکھائے گئے اور نعرے لگائے گئے'' ہمیں گمراہ کرنے والو ہوش میں آؤ''۔ جواباً ''شیم شیم'' کے نعرے لگے جو بہت جلد ''مردہ باد اور ناس ہو'' میں تبدیل ہوگئے۔ چونکہ سیمنار ہال میں ہو رہا تھا، پولیس ہال کے اندر تھی اور نہ باہر بلکہ ایک نزدیکی پارک میں جلسے کے حسبِ معمول بخیر وخوبی ختم ہوجانے کی توقع میں اطمینان سے بیٹھی تھی کہ اتنے میں ''گلّی ڈنڈا سیمنار' کا پہلا ڈنڈا اچلا جس پر پڑا وہ گلّی ہوگیا۔ اس کے بعد ڈائس پر لیڈروں کے بجائے جوتے چلنے لگے۔ سب سے پہلے میں خاموشی سے کھسک گیا۔ میری جگہ ایک لیڈر نے جلدی سے سنبھال لی۔ ابھی وہ صدر کا پوز بنانے میں مصروف ہی تھا کہ اس کی ناک پر ایک گندا انڈا پڑا اور منھ آملیٹ کر گیا۔ اتنے میں پولیس داخل ہوگئی۔ میں نے اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانکا۔ ''گلی ڈنڈے پر سیمنار'' اب ہال کے باہر ہو رہا تھا۔

کپور: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

جو ادیب طنز نگار ہیں ان میں سے ایک آدھ سے مجھے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان ہی میں سے یہ حضرتِ کپورؔ بھی ہیں۔ کپورؔ کی گرفت مجھ پر اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک مزاح نگار ایک طنز نگار ہیں اور اس سب کے باوجود ایسے ہیں جیسے کہ عام طور پر ہم آپ ہوتے ہیں۔ تنقید میں لوگ کبھی انھیں اچھا کہتے ہیں، کبھی برا۔ مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ آرڈی نینس کسے پسند ہوتے ہیں۔ الٹی چیز سیدھی یا سیدھی الٹی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر حیرت ضرور ہوتی ہے، کیونکہ طنز کا تقاضا ہے وہ یک رنگی میں ظرافت اور ظرافت میں یک رنگی پیدا کرے۔ مگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا غالبؔ، اقبالؔ اور کپورؔ۔ غالبؔ اور اقبال کی خطا اس وقت معاف کیجیے اور کپور کی بات کیجیے۔ جو طنز نگار اپنے قاری کو اپنا ہم راز و دمساز نہ بنا سکے وہ طنز نگار نہیں، مولوی یا لیڈر ہوگا؟ خود جل کر وہ دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسانا وہ امتیاز ہے جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا۔ زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا اس لیے کہ طنز نگار خود زمانے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیشہ بھول جانی چاہیے۔ طنز نگاروں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یہاں وہ باتیں ثابت نہیں کرنی ہیں جو ابھی ابھی کہی گئی ہیں۔ ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خرابہ ہوسکتا ہے، خون زیادہ خرابہ کم۔ ایسے ہی مضامین پر میں سر دھنا کرتا ہوں، یہی تاثیر دلیری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنا دیا۔ طنزیات ومضحکات میں طنز کا یہ ''تصرفِ دوام'' مبارک سمجھا جائے یا نہیں، حیرت انگیز ضرور ہے۔ انھوں نے طنز کی وضاحت کی ہے امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کر سکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔ اس گرفت میں کپورؔ ایسے آئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی استاد وارد ہوجائے۔ کپورؔ دو اور دو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاو دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو مجھے

گوارہ ہے''۔

(بہ طرزِ پروفیسر رشید احمد صدیقی)

''کپور کی طنز نگاری ہمارے ادب کے تہذیبی سرمایے کے اس سماجی اظہار سے منسلک ہے جو معاشرتی حالات اور میکانکی قوتِ نقد کے ارتقا کی جدوجہد، تخلیقی عمل اور جمود کے سماجی ٹکراو سے انفرادی پسندیدگی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس کا عمرانی مفہوم میرے نقطۂ نظر کے فلسفیانہ ربط اور اشترا کی حقیقت نگاری کی طبقاتی کش مکش کے اجتماعی شعور میں عام ہے۔ یہ ریاضیاتی تناسب اور مابعد الطبیعات کے لاشعوری تضاد کے بعد المشرقین میں مل جائے گی۔ کبھی کبھی یہ بعد المغربین کی نامیاتی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے مگر اجتماعِ ضدّین مارکسی نقطۂ نظر سے قطعی غیر منطقی ہے کیونکہ اس کے مثبت و منفی اثرات اپنے سطحی مفہوم کی توضیح کے لیے مروّجہ عصری روایات کی مادّیت، ہیئت اور مواد کی گتھیوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی جبریت کی عینیت پرستی جو ادب برائے زندگی کی ترویج میں زماں و مکاں کو اپنی گرفت میں لاکر رجعت پرستی کا تاریخی تجزیہ کرتی ہے، تاریخی مادّیت کے سماجی محرّکات کی سطحی خارجیّت کی داخلی کثافتوں سے آلود ہوکر اپنے مبہم مفہوم میں سماجی ڈھانچے کو پیش کرتی ہے۔ کپور کی واقعیت کا جامد تصور ان کے مزاحیہ نصب العین کی توجیہہ کردیتا ہے۔ طنز و ظرافت کی یہی مادّی کش مکش سماجی نظام کی حکیمانہ پیروڈی پیش کرتی ہے۔ اس سے سماجی پیچیدگیوں کے مافوق الفطرت مسائل پر روشنی پڑتی ہے اور بین الاقوامی بورژوا سماج کے مخصوص فلسفۂ حیات کی ذہنی کش مکش پرولتاری طبقے کے طبقاتی شعور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حاکم اور محکوم کی یہ کش مکش ان کے طنز کا نشانہ ہے''۔

(بہ طرزِ پروفیسر احتشام حسین)

''اردو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ صفر کا نقطۂ خیال ہے یا زبرے کی موہوم کمر۔ اس طرز کے طنز اور صحیح ظرافت میں فرقِ مشرقین ہے۔ یہ فرق یہاں کم معلوم ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ دل چسپ ضرور ہے لیکن اسے ظرافت سے کوئی خاص لگاو نہیں۔ اس کے پیش کرنے سے طنز و ظرافت کی اہمیت میں اضافہ ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ اوروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ دنیاے طنز میں اس کی وہی اہمیت ہے جس کی حامل پطرس کی ظرافت ہے۔ یاوہ گوئی مزاح کا بلند ترین نقطہ ہے اس سے آگے فکر کی رسائی نہیں اس محدود طاقت پر پرواز کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ تفصیل کی یہاں نہ گنجایش ہے نہ ضرورت، نہ وقت، غالبًا یہ پطرس کو دیکھ کر میدان میں آئے مگر افسوس کہ ان میں پطرس کے محدود اوصاف کا

بھی مطلق پتہ نہیں، ان کی کتابوں کے دیباچے پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے لیکن اس جہاد سے بھی کوئی دینی یا دنیوی فائدہ متصوّر نہیں۔ کیونکہ ان کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، تخئیل ادنا، علمیت غائب، شخصیت اوسط، املا غلط، انشا غلط، برخود غلط، پھر کورانہ تقلید میں مثلِ آفتاب روشن، اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان سے اور روحِ طنز سے کوئی لگاو بھی ہے۔ نظر حسبِ معمول جسم پر ہے، دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان کی عینک مانگے کی ہے۔ آواز اپنی نہیں محض ایک صداے بازگشت ہے۔ یہ آواز اردو طنز کی تکمیل ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے ان کی تحقیر مقصود نہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کی نظر سطحی ہے اسی وجہ سے ان کے قاری کو ذہنی جمناسٹک کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب تک ''زم گرم'' سے بہتر کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خیال کہ ''زم گرم'' اردو میں طنز و ظرافت کا بہترین کارنامہ ہے، نہایت حوصلہ شکن ہے جس کو یہ طنز کہتے ہیں اس کا ظرافت سے دور کا بھی لگاو نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طنز و ظرافت کے بیچ میں معلّق ہیں۔ ان کی اہمیت باوجود قابلِ قدر اضافوں کے بہت زیادہ نہیں، ان کی وقعت مشاعروں کے سبحان اللہ سے زیادہ نہیں۔ اس کا سبب ان کی مزاحیہ کج روی کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی حیثیت ایک ایسے طالبِ علم کی ہے جن کی شخصیت ایسی ہے جیسی کہ عام طور پر شخصیت ہوا کرتی ہے جو ان کی قوتِ ایجاد کی کمی ظاہر کرتی ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ یہ ایک طالبِ علم کے کارنامے ہیں جو قابلِ رشک ہیں۔ یہ مضامین اتنے شگفتہ و دل بہار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف اس کا اہل نہیں کیونکہ یہ عمرِ طبعی پر پہنچنے سے قبل ہی مصنف بن بیٹھے۔ یہ مضامین اسی عجلت اور کم سنی کا نتیجہ ہیں۔ اس سے ان کی مزاحیہ بوکھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی بوکھلاہٹ مصنف کو دلیر بنادیتی ہے اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس سے فرشتے لرزتے ہیں اور نقاد قلم اٹھاتے ہیں''۔

(بہ طرزِ پروفیسر کلیم الدین احمد)

''مجھے یہ دیکھنا ہے کہ کپور کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں، وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ و مزاحیہ ہوتے ہیں، ان مضامین میں میرے خیال جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے یعنی ان مضامین میں طنز ہے طنز۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ لکھ چکا ہوں طنز ہے۔ ایسا طنز جو سودا، غالب، اکبر، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، شوکت تھانوی، سید

محمد جعفری، شفیق الرحمٰن، غلام احمد فرقتؔ اور کنھیا لال کپورؔ کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کی بے شمار مثالیں مغربی ادب سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً پوپؔ، سوئیفٹ، لیوکاک، مارک ٹوئن وغیرہ کے یہاں جا بجا آپ کو ملے گا اور قدم قدم پر ملے گا، یہی وہ طنز ہے جس سے کپورا پنے مضامین میں طنز کا احاطہ کرتے ہیں۔ یعنی اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آجاتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یوں سمجھیے کہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہو اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے اور کچھ نہ ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور ہر جگہ اس بات کا ہونا مشکل ہے مگر پھر بھی انھوں نے اس مشکل کو بخوبی نبھا دیا ہے، نبھانا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں مجھے طنز ملتا ہے طنز۔ لہٰذا اس سے یہ بات بخوبی واضح، ثابت اور روشن اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں قاری کے علاوہ ناقد کو بہ آسانی طنز دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس طنز کو جوان کے یہاں ہے ہم سوائے طنز کے اور بھلا کہہ بھی کیا سکتے ہیں جو کہ طنز ہے یعنی طنز ہی ہے۔ اگر کچھ اور ہوتا تو بھی طنز ہوتا۔ طنز کا ہونا اس امر کی دلیل اور کلی شہادت ہے کہ ان مضامین میں ہم کو طنز مل جاتا ہے۔ ابھی میں نے دلائل وشواہد سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طنز نگار کپور کے یہاں مجھے طنز ملتا ہے جس میں ظرافت کی چاشنی، مغرب کے اثر سے آتی ہے اور بجنسہٖ موجود ہے جس کی وجہ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے یہاں جو چیز ہے وہ سوائے طنز کے اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ طنز ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے جس کے لیے قسم خدا کی، میں اب حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے''۔

(بہ طرزِ ڈاکٹر عبادت بریلوی)

''اس مخطوطے کو اختلاطِ طباعت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے اس لیے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا۔ اقتباس بالا ص:۹۲، سطر۲۰ خط جو میں نے خوش دامن کو تحریر کیا تھا حاشیہ نمبر ۷ مجھے بانکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ بوسیدہ اور سقیم حالت میں کپورؔ کے مضامین کا مل گیا ہے۔ خاندان میں جملہ پرسانِ حال کو اس کی خوش خبری پہنچا دو کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں مصروف ہوں۔ اندازہ ہے کہ اس کا تعلق بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے'' جزئی باتوں سے قطع نظر ۱۲ کتابوں کے ۴۷ دفتروں میں ایک نسخہ اور بھی ناقص مقدمہ ۱۰۱ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو مصنف کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حاشیہ ''دھوبی کی کاپی'' صفحہ ۷ سطر ۵ باوجودیکہ مضامین طنزیہ ہیں اور ظرافت کے باب میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں جا بجا مصدر کی علامتیں واضح نہیں کی گئی ہیں۔ صفت مشتبہ حالت میں ملتی ہے، کتاب میں صرف ایک بار ان کا استعمال ملتا ہے۔ اس سے مراد غالباً کاتب ہے جس کو شارحین نے کتابت کا غلط مطلب اخذ کر کے نہ جانے کیا قرار دے دیا ہے ج چ ۱۱صحت سے بعید ہے۔ یہ نسخہ بیسویں صدی سے متعلق ہے۔ (چ غ ۳/۵) جہاں تک میرا علم ہے یہ مضامین نصاب میں داخل کرنے کے لیے لکھے گئے۔ ''ہنگامۂ تحریر'' نسخۂ تبریزی مطبوعہ الناظر جلد ہشتم ۱۱ حوالے بغیر سند کے ہیں اس وجہ سے اسے مسترد سمجھا جائے۔ یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کیونکہ کسی مستند فرہنگ میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ یہ مہملات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو ۲۲x۱۲ فٹ کے ۶۶۲ رم صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۷ سطر فی صفحہ اب بھی مل جاتے ہیں مگر نایاب ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط کا اقتباس قابلِ توجہ ہے۔ ''میرا خط میرے نام'' رسائل میں شائع کروانے کی غرض سے تحریر کیا گیا تھا۔ اب تک کئی سال ناموں میں معمولی سی ردوبدل وترمیم کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ حافظے کے لیے ملاحظہ ہو۔ رسالہ ''نرالی دنیا'' ''الٹی دنیا'' ''سیدھی دنیا'' اور ''ہنگامی دنیا'' اس کے بعد چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ ہنگامہ ہو گیا تھا گو کہ میرے اعتراضات سنگین اور صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ گھریلو جھگڑے ۱۲۳ موٹر گائیڈ ۱۲۔ کرامات الّو عرف کالا جادو یعنی ساجن موہنی ۲۲ اصولی بحث میں یہاں صرف چند اعتراضات پر اکتفا کروں گا۔ مثلاً کتاب کے صفحہ ۲۴ سطر ۳۱ میں 'لا' کا غلط استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے مصنف کی تنبیہہ ضروری ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے کیونکہ اس کو معاف کرنے پر بھی اعتراض ہرگز رفع نہ ہوگا۔ پھر سند تو قطعی غلط ہے، حروف تہجی کی ترتیب سرے سے غلط ہے۔ ابجد کے لحاظ سے کتاب کا پہلا لفظ الف سے شروع کرنے کے بجائے 'ے' سے شروع کیا گیا ہے۔ مصنف سخت تنقید کا مستحق ہے۔ ۹/۸/۷/۶/۵/۴/۳/۲/۱/اس بات کو معترض الیہ کی جانب ہرگز نہ منسوب ہونا چاہیے۔ اس کے مایوس کن رویّہ سے برانگیختہ ہو کر فحش ودشنام سے کام لینا یہ بھی ایک کام ہوگا۔ اس قسم کے کاموں کی سخت ضرورت ہے۔ جن تحقیق کے شہ سواروں نے اس نسخے پر اب تک بھروسا کیا ان کے ساتھ تنبیہی کارروائی کا ہونا سخت ضروری ہے۔ الفاظ سے جا بجا مترشح ہوتا ہے کہ سہو کو رسماً روا رکھا گیا ہے۔ الف...... ب پ ت ٹ ث، ج چ ح خ، دڈ ذ، رزژ، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف، ک، گ، ل، م، ن، و، ء، لا، ھ، ی، ے ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ مثلاً ج کی جگہ ح کا استعمال کم از کم ۱۷ جگہ صریحاً کیا ہے جس کا نہ تو مزاح سے کوئی تعلق ہے اور نہ کاتب سے۔ یہ کھلا ہوا طنز ہے۔ رسالۂ حمزہ ۲۵ ۲۴ ۲۳ ۲۲ فتح میں 'ؤ' اور 'ط' نیک الفحت، فی افی الحت، الفتحہ کا مصدر مفارعی سکوت کی حالت میں ملتا ہے۔ مزاح میں مرثیہ کی

کیفیت کی ذمہ داری اسی لا ابالی پن پر ہے۔ ۲۵ ۲۵ لفظ کی تصغیر میں بامعنی لفظ کثیر الاستعمال محتاج ثبوت وسند کے اعتبار سے خبط کرنے کے لائق ہیں۔ فقرات نثر جا بجا نسخے میں ملتے ہیں جو قطعاً نا معتبر ہیں۔ عبارت ذیل کے نکتے اس سلسلے میں حوالے کے بعد بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے، کیونکہ ءءءء ءءءءپس جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نسخے کا تعلق بیسویں صدی سے ہرگز نہیں بلکہ اٹھارھویں صدی سے ہے اور مصنف مرد نہیں بلکہ کوئی خاتون ہیں جن کی اردو دانی میں ہمیشہ شبہ ہے ءءءءءءءء عروس ضمتین نہ صفحۂ اول وصفحہ ثانی میں جا بجا اشتباہ ہے۔ پھر یہ کہ کرۂ ہمزہ بحذف الف لغو اور سراسر مہمل و نا مستعمل، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاتون جن کو ہم کپور کے نام سے فی الحال فرض کیے لیتے ہیں ان کے لیے سہو طبعی بود، کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۲ ۲۲ ۳۲ ۴۲ ۵۲ ۶۲ ۶۵ ۵۸ ۵۸ ۵۹ ۵۷ ۵۶ ۵۵ ۵۴ ۵۳ ......ان طنزیات میں 'ش' کے ساتھ محترمہ 'خ' بھی آئی ہیں اور 'ب' کے ساتھ 'پ' بھی۔ مگر افسوس کہ 'ت' کے ساتھ 'ٹ' نہیں ہے ورنہ ان طنزیات کی کچھ اور ہی شان پیدا ہو جاتی۔ ہائے ہوّز کی سخت مٹی پلید کی گئی ہے۔ مصنف خود اس میں اپنے طنز کا نشانہ بن گیا ہے۔ 'ہائے حُطّی' کی ٹھوسم ٹھانس سے طبیعت میں ایک قسم کا بھاری پن اور گراوٹ محسوس ہوتی ہے۔ طنز سطحی ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوچشمی ہے اور حمزہ کے ساتھ بے توجہی کھٹکتی ہے 'واؤ' کا کثرتِ استعمال کلاسیکی شان کے خلاف ہے۔ اس کو روایت سے بغاوت متصور کیا جائے گا۔

مخترعات مصنوعی جو منافقوں نے بعد میں بطورِ حاشیہ پیش کیے ہیں، جمع حاضر، واحد متکلم غائب کے صیغے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ غریب نہیں تھا بلکہ سماج میں اس کی اہمیت تھی مگر اس سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے اس کے لیے کوئی مستند لطیفہ پیش کیا جانا چاہیے تھا، ضمائر میں مذکر و مؤنث کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ اس میں مغرب کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ ضمیر، فاعل، فعل، صفت، مصدر، حرف، مفعول، اس کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ زیرِ نظر مخطوطے میں کپور نام کا فرد مرد نہیں بلکہ عورت تھی اور طنز نگاری میں یدِ طولیٰ رکھتی تھی جس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی گنجایش باقی رہ جاتی ہے کہ عورت بھی تھی یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(بہ طرزِ قاضی عبدالودود)

❋

کلیم الدین احمد

یہ بات کوئی ۱۹۵۴-۵۵ء کی ہے جب میں استاذی پروفیسر سید احتشام حسین کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اگر وہ تنہا ہوتے تو ایک کتاب بہت غور سے پڑھتے یا اس پر پنسل سے نشان لگاتے ہوتے۔ ہم لوگوں کو بڑی جستجو رہتی کہ آخر یہ کون سی کتاب ہے؟ اس کتاب پر ایک موٹا سا چمک دار کور چڑھا رہتا جو غالباً کسی کلینڈر کو کاٹ کر تیار کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنے منہمک اور مستغرق ہوتے کہ ہماری موجودگی تک کا نوٹس نہ لیتے۔ اس کو پڑھتے میں ان کے چہرے کا رنگ بدلتا رہتا اور اکثر بڑبڑاتے بھی۔ ہمارا محتاط اندازہ یہ تھا کہ یہ یا تو تنقید پر کوئی کتاب ہے یا پھر اس کی شرح یا کنجی ہے مگر ہمارے ایک دوست شوکت عمر کا محتاط اندازہ تھا کہ اس کتاب کا تعلق بارود سازی کی صنعت سے ہے یا پھر اس میں بم بنانے کا نسخہ درج ہے۔ وہ کتاب رفتہ رفتہ سوت کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ایک دن دوپہر کو ہم لوگ مئی جون کی گرمی میں پہنچے تو دیکھا کہ قبلہ تو بے خبر انٹا غفیل ہیں اور سرھانے میرؔ کے وہی سوت نما کتاب دھری ہے۔ ہم لوگوں نے آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے، خاموشی سے کتاب اٹھائی اور غائب ہو گئے۔

گولہ گنج میں مہدی کے ہوٹل میں ان تمام صاحب زادوں نے جو مستقبل میں اردو شعر و ادب کے چاند ستارے قرار پانے والے تھے، اس کتاب کو بہت غور سے کھولا۔ کتاب کا کور نکال کر الگ کر دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:

''اردو تنقید پر ایک نظر''

از کلیم الدین احمد

ساری کتاب پر معلوم ہوتا تھا کہ پنسل سے چاند ماری کر کے گود دیا گیا تھا۔ کچھ اس قسم کے سوالات اٹھائے گئے تھے۔

''آخر کلیم الدین کیا چاہتے ہیں؟''

''بات تو صحیح ہے مگر آخر یہ انداز کس حد تک مناسب ہے؟''

''کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا''۔

''مخالفت تو آسان ہے مگر مارکسزم سمجھنا بہت مشکل ہے''

''بات تو سیدھی سی ہے مگر اس میں برہمی یا طنز کی کیا گنجائش تھی؟''

''؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟''

''..................................''

() () ()

( )

''تکرار''

''ژولیدہ بیانی''

''آخر اس بات کا مغرب سے کیا تعلق؟''

''غزل سے انگریزی شاعری یا مغرب کا کیا واسطہ؟''

''یہ تعریف ہے یا ہجوِ ملیح؟''

''مطلب واضح نہ ہوسکا''۔

''آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

محسوس یہ ہوتا تھا کہ استادِ محترم اس کتاب کو پڑھتے نہیں بلکہ اس کتاب پر مصنف سے ذہنی کشتی لڑتے تھے۔ جا بجا کتاب پر مارکس اور انگلز کے اقوال زرّیں درج تھے۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ کلیم الدین احمد کوئی بہت ہی بے ڈھب آدمی ہے جو ہمارے استاد کو بری طرح پریشان کیے ہوئے ہے۔ مجبوری یہ تھی کہ معاملے کی تہہ یا گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت ہم میں سے کسی میں نہ تھی اور کتاب غائب کرنے کے بعد اب مصنف کے بارے میں استاد سے دریافت کرنا بارود کو آگ دکھانا تھی اس لیے کلیم الدین روزِ اول ہی ہمارے لیے معمہ بن گئے۔ اب کیا کیا جائے۔ طے پایا کہ چونکہ ہم لوگوں نے سرور صاحب کو سردست کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے اس لیے ان سے جا کر اتا پتا معلوم کیا جائے، اس لئے

دھوپ میں سرور صاحب نے ہم لوگوں کو نہایت مشکوک نظروں سے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ بہت ہمت کر کے ایک صاحب نے بڑا ہی بنیادی سوال کیا۔

''سر! ہم لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تنقید کس کو کہتے ہیں''

'ہاں بھئی! یہ ایک بات ہوئی''

سرور صاحب نے بڑی تفصیل سے نہایت سادہ و آسان طریقے سے اس طرح سمجھایا کہ موضوع کو پانی کر دیا جو ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔

پھر ایک صاحب زادے نے جو آج کل ایک یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ اردو، پروفیسر اور نامی گرامی نقاد واقع ہوئے ہیں۔ اپنی تسلّی کے لیے پوچھا۔

''سر! جو تنقید کرتا ہے اسے کیا کہتے ہیں؟''

''ناقد......! تنقید کرنے والا............نقاد''

ایک دوسرے صاحب زادے نے ٹکڑا لگایا

''اردو میں بے حد اہم نقاد کون کون ہیں؟''

''حالی، شبلی، عبدالحق، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، کلیم الدین احمد، پروفیسر احتشام حسین وغیرہ۔ کلیم الدین احمد کا نام سنتے ہی ہمارے چہرے گلاب کی طرح کھل اٹھے۔ ایک صاحب زادے نے پوچھا:

''سر! کلیم الدین احمد کی کیا اہمیت ہے اور کس قسم کے نقادوں میں ان کا شمار ہے؟''

''بھئی! موجودہ دور میں سچی بات تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ انہی کا شہرہ ہے۔ بہت ہی اہم نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں کچھ انتہا پسندی ہوتی بھی ہے، نہیں بھی ہوتی ہے۔ کلیم صاحب اصولِ تنقید پر زور دیتے ہیں مگر خود اصولوں پر ذرا کم ہی چلتے ہیں۔ چلتے بھی ہیں۔ ان کے یہاں توازن کی جگہ شدت ہے مگر توازن ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ کچھ صاف نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے اس لیے لوگ جھنجھلاتے بھی ہیں۔ مگر باتیں بڑے پتے کی کرتے ہیں۔ ان کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے اور خوب ہے۔

غرض سرور صاحب بہت دیر تک کلیم الدین احمد کے میزانِ نقد کے دونوں پلڑے برابر کرتے رہے جس سے ہم لوگ صرف یہ اندازہ کر سکے کہ پروفیسر آلِ احمد سرور بھی ضربِ کلیم سے بے حد خائف ہیں اور کلیم الدین احمد ضرور دہشت پسند نقاد ہیں اور ہم لوگ وہاں سے سلام کر کے رخصت بلکہ منتشر ہو گئے۔

دوتین دن بعد ہم لوگ احتشام صاحب کے یہاں گئے تو دیکھا کہ وہی کتاب پھران کے ہاتھ میں ہے اور کافی خونخوارانداز سے ہے کہ اس پرایک سرخ رنگ کا کور چڑھا ہوا تھا۔ غالباً نئی خرید کر لائے تھے اور سوویت دیس کا ورق پھاڑ کر اس پر چڑھایا گیا تھا جس پر ہنسیا، ہتھوڑا اور مزدور کے خون کی سرخی تھی۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ یہ بھی کسی کو یاد نہ رہا کہ وہ کتاب کون صاحب کے پاس پہنچی۔ دن گزرتے رہے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ سرور صاحب کو بخار چڑھ گیا۔ ہم لوگ دیکھنے گئے۔ آنے والوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ عیادت کا انداز کچھ تعزیت والا تھا۔ بار بار کلیم صاحب کا نام سنائی دیتا۔ معلوم ہوا کہ تازہ ''نقوش'' میں سرور صاحب کو کلیم صاحب نے دھن ڈالا ہے۔ اہلِ علم کا مجمع تھا۔ اندازِ گفتگو میں ٹھہراو اور صبر وضبط کا ایسا انداز تھا گویا لکھنؤ کا قلعہ کلیم الدین احمد نے ڈھا دیا ہے اور سالارِ قافلہ بیمارِ غم بنا ہوا ہے۔ سامنے کتاب عیادت کے طور پر ''نقوش'' رکھا ہوا تھا۔ جسے لوگ اٹھا کر پڑھتے اور پھر کچھ دبا دبا سا تبصرہ کرتے۔ انداز گفتگو کچھ تسلی وڈھارس والا تھا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی گھر کا بھیدی بنے آپے بلکہ جامے سے باہر تھے اور بے طرح ناک میں ڈکرار ہے تھے اور جب وہ ناک میں منمنا کر کہتے:

''سنر روسنر رو! کلیم الندین نے بینہ بانت تو ٹھینک کہیں ہیں'' تو سرور صاحب کی کمزوری بڑھ جاتی اور وہ خلافِ قاعدہ جھلاتے نظر آتے۔ سرور صاحب ہم لوگوں کو لفٹ ذرا کم ہی دیتے تھے اس لیے لڑکے لوگ کچھ خوش ہی تھے کہ کوئی تو انھیں ملا۔ غرض عرصے تک کلیم صاحب کے اس مضمون کے چرچے رہے اور یہ بھی افواہ گرم ہوئی کہ سرور صاحب کلیم صاحب سے ملنے پٹنہ گئے ہیں۔ ایک صاحب زادے جو آج کل امریکہ میں پروفیسر ہیں ان کا حلفیہ بیان تھا کہ وہ خود برتھ ریزرو کرانے گئے تھے۔

رفتہ رفتہ یہ چرچے ختم ہوئے اور ان کی جگہ ہند پاک کرکٹ نے لے لی کہ اچانک پٹنہ میں بیٹھے بٹھائے کلیم صاحب نے دوسرا ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ وہ یہ کہ تازہ ''نقوش'' میں انھوں نے احتشام حسین کی تنقید نگاری پر مضمون سرکر دیا تھا۔ اس کا چھپنا تھا کہ کہرام مچ گیا۔ لوگ جوق در جوق تعزیت کے لیے احتشام صاحب کے پاس پہنچنے لگے۔ احتشام صاحب عجب سوگوارانہ انداز سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے انھیں باقر مہدی سنبھالے ہوئے تھے دوسری طرف مرزا جعفرحسین اور ایک ان کے شاگرد جو آج کل نقاد ہوگئے ہیں۔ باقر وغیرہ کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ احتشام صاحب کبھی ٹھنڈا کرتے کبھی جھڑک دیتے۔ جوابی کارروائی کی دھمکی پر سختی سے منع کرتے۔

''نہیں بھئی! بالکل کوئی ضرورت نہیں''۔

''معلوم نہیں کیسے کیا ہوجاتا ہے''۔

''خاموشی بہتر ہے۔ معاملہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ الجھانے سے حاصل''۔

ہم نے تسلی دیتے ہوئے عرض کیا:

''حضور! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ کلیم صاحب نے آپ کو کم از کم ہاتھی تو مان لیا ہے کہ ''احتشام حسین جب آلِ احمد سرور کی نقل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش فعلیاں کر رہا ہے''۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ احتشام صاحب چند دن بیمار اور کئی دن جھنجھلائے رہے۔

جب علی گڑھ میں ایم۔ اے کرنے کے دوران تنقید کے پرچے سے ہمارا سابقہ پڑا تو ہم نے کلیم الدین احمد کی کتابیں ''اردو تنقید پر ایک نظر'' اور ''اردو شاعری پر ایک نظر'' بہت غور سے پڑھیں۔ اسی زمانے میں ہم نے اردو ناقدین کی ایک پیروڈی ''کپور کا فن'' کے عنوان سے لکھی۔ اس میں کلیم الدین احمد کے اندازِ بیان کا بھی چربہ اڑایا جو بے حد پسند کیا گیا۔ سرسید ہال میگزین ''اسکالر'' کا میں ایڈیٹر تھا، اس کا پیروڈی نمبر نکالا۔ پہلی بار یہ پیروڈی اس میں یا علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ کلیم صاحب کے ایک شاگرد ہمارے گہرے دوست تھے۔ ان کے اصرار پر ہم نے وہ رسالہ کلیم صاحب کو ڈاک سے بھیج دیا۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ کلیم صاحب کو خط کا جواب دینے کی عادت نہیں ہے مگر وہ بہت پڑھتے ہیں اور آپ کا مضمون ضرور پڑھیں گے اور پسند کریں گے۔ خلافِ توقع چند دن بعد مجھے کلیم صاحب کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا:

''مکرمی!

پرچہ کا شکریہ۔ ''کپور ایک مطالعہ پسند آیا۔ پیروڈی خوب ہے۔ اردو کے لیے یہ نئی چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو مغربی ادب کے مطالعہ میں دلچسپی ہے۔ اس فن کو ترقی دیں۔

آپ کا خیال غلط ہے۔ میں نے برا نہیں مانا۔ پیروڈی تو شہکاروں کی ہوتی ہے۔ یہ تو کارٹونی فن ہے۔ آپ کا انداز استہزائیہ نہیں بلکہ اسلوب کو نمایاں کرنے کا ہے۔ اسے آپ جو اپنی کتاب شائع کرنا چاہتے ہیں اس میں ضرور شامل کریں۔ کتاب کے نام کی فرمائش مصروفیت کی نذر ہوگئی۔ آپ خود کوئی اچھا سا (مختصر) نام رکھ لیں۔ پٹنہ آئیں تو ضرور ملیں۔ ٹیلی فون کر لیں۔ قاضی صاحب خیریت سے

ہیں۔ پیروڈی کی اطلاع پہلے انھوں نے دی تھی۔ وہ بھی خوش ہیں۔

کلیم الدین احمد''

ایک طالبِ علم کی اس سے بڑھ کر کیا حوصلہ افزائی ہوسکتی تھی۔ خوشی کے مارے برا حال تھا۔ احباب اور اساتذہ میں کئی دن کلیم صاحب کے خط کی نمایش کا سلسلہ جاری رہا اور بار بار دوستوں کو چائے پلانا پڑی۔

غالب صدی تقریبات کا ہنگامہ پٹنہ یونیورسٹی میں برپا ہوا تو مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں پروفیسر اختر اورینوی کا مہمان تھا۔ ان تقریبات کا افتتاح پروفیسر کلیم الدین احمد نے کیا تھا بس وہ دو جملے بولے تھے اور سینٹ ہال تالیوں سے گونج گیا تھا۔

''غالب کے زمانے میں ان کی عزت افزائی جو کی گئی وہ ان کی حیثیت سے کم تھی اور اس زمانے میں جو عزت افزائی ہو رہی ہے وہ ان کی حیثیت سے زیادہ ہے''۔

میں نے پہلی بار انھیں بہت غور سے دیکھا۔ وہ مجھے نہایت سرخ و سپید تندرست قسم کے بزرگ لگے۔ بوٹا سا قد، لمبائی کے مقابلے میں چوڑان اطمینان بخش۔ نہایت سنجیدہ، متین، خاموش، لیے دیے، چہرے پر وقار اور آسودگی۔ خاموش بیٹھتے تو چہرہ تقریباً چوکور مگر بھرا بھرا۔ مسکراتے یا بات کرے تو منھ گول ہو جاتا۔ غرض عام انسانی چہروں سے خاصا مختلف۔ جب اجلاس ختم ہوا اور لوگوں نے انھیں گھیرا تو میں نے بھی انھیں سلام کیا، جس کا جواب انھوں نے Face Expression سے دیا اور میں بس دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ چل دیے۔ ان کے ساتھ وائس چانسلر، ڈاکٹر ممتاز احمد، پروفیسر عطا کاکوی اور ڈاکٹر اختر اورینوی تھے جو انھیں موٹر تک پہنچا کر واپس آگئے۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ کلیم صاحب کے یہاں آپ لوگوں کے اعزاز میں ایک ایٹ ہوم ہے۔ آپ لوگ سے مراد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر حسن، ڈاکٹر قاضی عبدالستار اور خاکسار۔

شام کو موٹروں پر اختر اورینوی صاحب کے یہاں سے ہم لوگ کلیم صاحب کے یہاں روانہ ہوئے۔ سڑک ابھی بن رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر کنکر پتھر تھے۔ برآمدے میں لمبی لمبی میزیں، آمنے سامنے کرسیاں جن پر مہمان اور میزبان بیٹھ گئے۔ کلیم صاحب ایک کونے میں کھڑے مسکراہٹ سے لوگوں کو سلام اور باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ جو نوجوان اس تقریب کے انتظام اور ہماری پذیرائی میں پیش پیش تھے وہ ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر محمد صدیق، ڈاکٹر خالد رشید صبا اور ڈاکٹر محمد طیب ابدالی تھے۔ طیب ابدالی بہت دبلے

پتلے تھے اور ممتاز صاحب بالکل پہلوان معلوم ہوتے تھے اور نہایت تندرست۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال بھرا بھرا چہرہ کھلتا ہوا رنگ۔ سب سے زیادہ خوش پوشاک ڈاکٹر خالد رشید صبا اور ڈاکٹر صدیق تھے۔

میں ایک دفعہ کرسی سے اٹھ کر کلیم صاحب تک گیا مگر ان کی خاموشی نے پسپا کر دیا۔ پھر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈاکٹر اختر اورینوی سے کہا:

''بھئی! یہ تو بولتے ہی نہیں ہیں''

''خوب بولتے ہیں مگر اس کی ایک ترکیب ہے''

''وہ کیا؟''

ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولے:

''کلیم صاحب ملازمت میں توسیع چاہتے ہیں مگر بیمار ہیں بیماری چھپاتے ہیں۔ آپ ان سے صحت اور خیریت پوچھیے۔ ہارٹ، بلڈ پریشر، شوگر وغیرہ کے بارے میں اور بلا کسی کا نام لیے کہیے کہ لوگوں نے بتایا کہ آپ بیمار ہیں۔ پھر دیکھیے کیسا بولتے ہیں''۔

غرض انھوں نے ٹھیل ٹھال کر ہمیں پھر کلیم صاحب کے پاس بھیج دیا۔ ہم نے اختر صاحب کے نسخے پر عمل کرتے ہوئے جا کر ان کی صحت کو کریدا۔ کلیم صاحب خوب بولنے لگے۔ پہلے تو یقین دلایا کہ وہ قطعی تندرست ہیں۔ پھر بتایا کہ لوگ بدنام کرنے کے لیے ایسا کہتے ہیں۔ پھر میں نے اپنی نئی کتاب ''مضامینِ پاشا'' کے بارے میں کہا کہ لانا بھول گیا۔ بولے'' آپ کی یہ اور دوسری کتابیں میرے پاس ہیں۔ میں پڑھ چکا ہوں کچھ مضامین پر پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ بولے'' ادب میں مارشل لا'' اور ''رستم امتحان کے میدان میں'' Prose میں Mass Epic ہیں۔ مختصر خاکے کے آرٹ پر بولے بہت مشکل فن ہے۔ آپ کے خاکے پڑھ چکا ہوں۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے۔'' غرض وہ بول رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ جب میں لوٹا تو احباب نے حیرت سے پوچھا ''کلیم صاحب آپ سے تو خوب باتیں کر رہے تھے'' ۔''اختر صاحب مسکرائے۔ ان کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ میں بیماری کا ذکر گول کر گیا اور بولا:

''میری ظرافت کے فن پر روشنی ڈال رہے تھے۔ مضامین کی تعریف کر رہے تھے''

''تعجب ہے''۔

''تعجب تو مجھے بھی ہے''

جب لکھنؤ سے ہم نے سیوان میں ڈیرہ جمایا تو پٹنہ کے چکر شروع ہو گئے۔ جب بھی پٹنہ جاتے

اور ذرا بھی فرصت ملتی تو کلیم صاحب کو ٹیلی فون کرتے اور وہ عموماً شام کا وقت دیتے۔ پھر کلیم صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمارا محتاط اندازہ ہے کہ وہ مردم شناس تو نہ تھے مگر بڑے مروت کے انسان تھے۔ عموماً عشا بعد لکھنا پڑھنا شروع کرتے جس کا سلسلہ عام طور پر صبح چار بجے تک چلتا۔ دس بجے کے قریب وہ سو کر اٹھتے۔

نیاز فتح پوری کی طرح کلیم الدین احمد بے حد باقاعدہ انسان تھے۔ اردو بورڈ کی لغت کا دفتر ان کے گھر پر تھا جس میں بہت سے لوگ کام کرتے۔ کلیم صاحب دن بھر پابندی سے بیٹھ کر کام کرتے۔ ان کے آفس میں دنیا بھر کی سیکڑوں ڈکشنریاں اور ڈکشنری سازی کا ہر قسم کا ساز و سامان تھا۔ وہ مشین کی طرح کام کرتے۔ دفتری اوقات میں ملاقاتی سے گفتگو تقریباً نہیں کے برابر ہوتی۔

کلیم صاحب تنہائی میں خوب باتیں کرتے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انھیں جنسی موضوعات اور اسکنڈلز میں بڑی دل چسپی تھی۔ وہ بہت کم کھلتے لیکن جب بے تکلف ہو جاتے تو خوب ہنستے بولتے۔ ساتھ میں اگر کوئی اجنبی ہو یا کسی نے ان کی عظمت کا قصیدہ پڑھ دیا تو وہ شرما کر بالکل خاموش ہو جاتے۔ کلیم صاحب کے مزاج میں مروت اور دریا دلی بہت تھی۔ تنقید کے مزاج میں وہ جتنے گرم تھے روزمرہ کی زندگی میں اتنے ہی نرم۔ ہمیشہ سلوک کرنے کے لیے تیار رہتے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دو ایک سفارشیں ان سے کی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے وہ کام بڑی خوش اسلوبی سے نہ صرف کر دیا بلکہ مجھے خط لکھ کر اس کی اطلاع بھی دے دی۔ یوں تو کلیم صاحب خوب باتیں کرتے بلکہ آخری زمانے میں صرف وہی بولتے تھے۔ کلیم صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے ان کے طریقۂ تنقید خاص طور پر اقبال کے سلسلے میں قطعی اختلاف ہے مگر اس کے باوجود اس کا تعلقات پر کبھی کوئی اثر نہ پڑا۔ ان میں اور قاضی عبدالودود میں کبھی نہ پٹی۔ بیش تر میں قاضی صاحب کے یہاں سے ان کو فون کرتا لیکن کبھی انھوں نے قاضی صاحب کے خلاف میری موجودگی میں ایک لفظ نہیں کہا۔

میں جب بھی کلیم صاحب سے ملنے جاتا تو وہ ''معاصر'' کا نیا شمارہ دیتے۔ اس کا مجھے ممبر بنایا، اس میں لکھنے کی فرمایش کرتے۔ اگر کبھی بھی کسی کتاب یا رسالے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ لا کر کہتے ''لیجیے آپ کی نذر ہے''۔ اکثر انھوں نے بڑی قیمتی کتابیں مجھے ''نذر'' کر دیں۔

ہمارے کالج کا مقدمہ ہائی کورٹ میں تھا۔ جسٹس فضل علی نے اس کی تحقیقات کلیم صاحب کے سپرد کی۔ مجھے اس کا علم تھا اور اس دوران برابر میں ان کے یہاں جاتا بھی تھا مگر میں نے کبھی اس سلسلے میں

کوئی بات نہیں کی۔ جب میں چلنے لگتا تو کلیم صاحب مجھے روک کر پھر باتیں کرنے لگتے۔ گھما پھرا کر سیوان کا ذکر کرتے مگر میں نے کالج کے سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی۔ انھوں نے یونس صاحب سے اس بات کی بڑی تعریف کی اور سیوان جا کر میرے یہاں قیام کرنے کا پروگرام بھی بنایا اور کہا کہ ''جمال صاحب سے انکوائری میں بڑی مدد ملے گی'' ان کے سیوان آنے سے چند یوم قبل اچانک وہ وفات پا گئے اور یہ باتیں مجھے خود ان کے گھر والوں اور یونس صاحب سے معلوم ہوئیں جب میں ان کے انتقال کی ریڈیو سے خبر سن کر تعزیت کے لیے پٹنہ گیا۔

اب بھی ان کا خیال آتا ہے اور یاد آتا ہے کہ عالمی ادب یا انگریزی ادب پر میں نے انھیں چھیڑ دیا ہے اور وہ مسلسل بولے چلے جا رہے ہیں اور محسوس ہوتا کہ علم و دانش کا ایک سمندر ابل رہا ہے۔ ان کی ہمارے لیے اس وجہ سے بھی ہمیشہ ایک اہمیت رہے گی کہ بہار کی شناخت ہمارے جن جواہر سے اردو دنیا کے خزانے میں ہوتی ہے ان میں کلیم الدین احمد کی حیثیت کوہِ نور کی ہے۔ کلیم صاحب اصولِ تنقید پر زور دیتے تھے۔ متن اور شخصیت کے مطالعے پر ان کا زور تھا جس سے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی تنقید کا انداز کچھ Demolition Expert کا تھا جس کی ادب میں ضرورت بھی ہے اور اہمیت بھی۔ بت سازی سب کچھ نہیں، بت شکنی بھی ادبی اور تاریخی سائیکل کا جزو لاینفک ہے۔ احتساب اور گرفت کا فن ان پر ختم ہو گیا۔ اب ضرورت یہ ہے کہ ان کے کارناموں کی ایڈیٹنگ اور تلخیص کی جائے تاکہ کام کی باتیں ہم گرہ میں باندھ سکیں اور بقیہ کی حیثیت تاریخی رہ جائے۔

کلیم صاحب کے علمی ذخیرے میں بڑی نادر و نایاب کتب ہیں۔ شیکسپیئر کے بیش تر پہلے ایڈیشن انھوں نے مجھے دکھائے تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خزانے کو محفوظ کر دیا جائے۔

مجھے اب بھی کلیم صاحب یاد آتے ہیں خصوصاً ان کی کوئی کتاب میرے ہاتھ میں ہو یا پھر جب میں بہار اردو اکادمی جاتا ہوں اور راستے میں ان کا گھر پڑ جائے تو ایک دم مجھ پر اداسی چھا جاتی ہے اور ان کا چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ بزرگوں میں جن سے بہت کچھ حاصل کیا ان میں وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔

فنِّ لطیفہ گوئی

مختصر ترین واقعے کو جس میں مزاح کی چاشنی ہو عمدہ اور لطیف پیرایے میں اس انداز سے بیان کیا جائے کہ ان الفاظ یا فقروں کے سننے والوں کو ہنسی آ جائے لطیفہ کہیں گے۔ اس کے لیے حسنِ بیان و حسنِ ادا کی پابندی ضروری ہے۔ واقعہ کی دل چسپی ندرتِ بیان کے ساتھ اعتدال لیے ہو۔ سنانے والوں میں اور سننے والوں میں ذہنی ہم آہنگی تشبیہہ و استعارہ کے ربط کے ذریعہ ہو جو لطیفے کی جان ہیں اور جن کی مدد سے ہمارے جذبات ہمارے تخیل سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

لطیفے کا حسن اس کے اختصار میں ہے۔ ادھر مقرّر کے منھ سے پھول جھڑنا شروع ہوں ادھر محفل میں قہقہوں کے جگنو چمکنے لگیں اسی لیے اس کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ لمحاتی طور پر یہ ذہنی کھیل ایک ہنگامی فرار ہے۔ اس مشینی دور کی اکتا دینے والی زندگی سے جس میں فرد کی حیثیت محض تماشائی کی نہیں وہ خود مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ لطیفے کے وقفے تک انسان سنجیدگی کے خول سے باہر آ جاتا ہے اور جو وقت لطیفہ کہنے اور سننے میں کٹتا ہے وہ روز مرّہ کے غم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر کے لیے سب آپس کے اختلافات کو بھول کر ایک دوسرے کے ہم آواز ہو جاتے ہیں۔

کچھ مشینی دور پر ہی موقوف نہیں ہر دور اپنے مصائب و مسائل اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں اس نے ہمیشہ اپنی راہ میں کانٹے بچھائے اور ہٹائے ہیں وہاں اس نے کانٹوں میں پھول کھلانے کی جد و جہد بھی جاری رکھی ہے۔ اس حیوانِ ظریف کی یہی خوش طبعی ہمارے موضوع سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

لطیفے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذاقِ سلیم پر بار نہ ہو، سماعت پر گراں نہ گزرے اسی لیے لطیفے کو روحِ فصاحت اور نشاطِ روح کا درجہ دیا گیا ہے۔ لطیفہ ایک نہایت ہی لطیف شے ہے جس کے بیان کے

لیے ایک خاص قسم کی ذہانت، حاضر جوابی اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہے۔ اگر لطیفہ بحرِ طویل میں چلا گیا تو وہ حکایت، داستان، قصّہ، افسانہ غرض کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر لطیفے کے ذیل میں ہرگز اس کا شمار نہ ہوگا۔ پھر اس میں پانی میں اٹھنے والے بلبلے کی سی حبابی کیفیت نہ رہے گی۔ اسے خندۂ قلقل نہ کہا جا سکے گا۔ اس کے انوکھے پن کا خمار اتر جائے گا۔

لطیفہ اچھا ہے لیکن سنانے والا اس کے فن سے ناواقف، جذبات، تاثرات و لہجہ کے اتار چڑھاو پر قدرت نہیں رکھتا۔ دورانِ بیان اصلی نکتے سے ہٹ جاتا ہے۔ تمہید کو طول دے دیتا ہے، کھانسنے اور کھنکھارنے لگتا ہے، درمیان میں بقیہ لطیفہ بھول جاتا ہے تو پھر لطیفے کی نزاکت، تجسس و لطف رخصت ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ نازک مسئلہ لطیفہ لکھنے کا ہے۔ مخصوص واقعات، حالات اور ماحول سے متعلق لطیفہ ہو سکتا ہے کہ صفحۂ قرطاس پر آ کر بے روح و بے جان ہو جائے پھر اس میں وہ کشش بھی باقی نہ رہ جائے جسے ہم کاغذ کے پھولوں ہی سے تشبیہ دے سکیں اور بعض لطیفے تو ایسے ہوتے ہیں جنھیں خود بیان یا ادا کیا جا سکتا ہے۔ بہت کم لطیفے ایسے ہوتے ہیں جو کاغذ پر آنے کے بعد بھی اسی قدر تازہ اور سدا بہار رہ جائیں۔

لطیفے کی ابتداء انسانیت کے آغاز کی داستان ہے۔ انسان جوں جوں تہذیب سے آشنا ہوتا گیا اس کا جوہر نکھرتا گیا۔ جیسے جیسے اس کی اقامتی زندگی میں ٹھہراو آتا گیا وہ عام انسانی تعمیر و ترقی میں زیادہ گہری دل چسپی لیتا گیا۔ اس کی یہی دل چسپی وہ نکتہ ہے جہاں سے لطیفے کے آغاز اور فنونِ لطیفہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کو شروع میں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ رونے کی طرح ہنسنے کے لیے بھی پابند و مجبور ہے۔ اس کے نفسیاتی و فطری جواز سے وہ کبھی لاشعوری طور پر بھی بے خبر و منکر نہ ہو سکا۔ ہنسی کے عضویاتی عمل سے قطعِ نظر وہ بذلہ سنجی کا ملکہ قدرت کی جانب سے لے کر آیا تھا جس نے اسے ثابت قدمی، مسلسل جد و جہد اور حرکت پر قائم رکھا۔ اس کے انھیں عزائم نے زندگی، زندہ دلی اور شوخیوں کے سایے میں قدرت اور اس کے مظاہر پر فتح پائی۔ غاروں اور پیڑوں پر رہنے والے نیم وحشی انسان نے اپنی حس کا اظہار دشمن کی کھال اتار کر اور اس کا سر قلم کر کے کیا۔ اس میں عصبیت تھی، جھنجھلاہٹ اور جہالت تھی...... یہ وحشیانہ جذبہ تہذیب کے عروج نے دبایا تو نہیں مگر کم ضرور کر دیا۔ آج بھی غصے سے پاگل ہو جانے اور عقل سے ہاتھ دھو لینے والے انسان کی دیوانگی اور بچوں میں یہ جذبہ مل جاتا ہے جس میں تکلیف دے کر لطف اٹھانے کی آرزو ملتی ہے۔ کیلے کے چھلکے سے پھسل کر گرنے والے کسی موٹے آدمی پر

ہنسنے، کسی نیم پاگل انسان کو ستانے وشکار کی صورت میں اس کا اظہار آج بھی عام ہے۔ اس عملی مذاق کے پردے میں بنیادی طور پر وہ انسانی جذبہ پسِ پشت رہ جاتا ہے جو کسی بیمار، بے کس و بے زبان سے ہمدردی و مدد کرنے پر اکساتا ہے۔ وہ کمزوریاں اور خامیاں جو آج بھی انسان کے بس میں نہیں ہیں اور جن کے لیے وہ قدرت کے آگے بے دست و پا ہے اس کو لطیفے میں اڑا دینا ایک ایسا لطیفہ ہے جس میں کوئی جان، کوئی روح اور کوئی آمد نہیں، جہاں طنز کا وار خود اپنے اوپر ہوتا ہے اور اس سے محض ذہنی پستی و کج روی کا اظہار ہوتا ہے جس میں آورد ہی آورد ہے۔ عملی مذاق یا لطیفے کی انتہائی ناتراشیدہ و ناپختہ شکل نے رفتہ رفتہ ارتقائی منازل طے کر کے اب یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی ذہانت کی اپیل پر ہنستا ہے۔ کون متکلم ایسا ہے جو اپنے ہم جلیسوں و ہم زبانوں کو خوش کرنا پسند نہ کرے گا۔ بذلہ سنج اس قابلیت کا مالک ہوتا ہے۔ بالعموم وہ ہر دل عزیز بھی ہوتا ہے۔ بذلہ سنجی کے پاے لطافت و نزاکت نے اہلِ علم کو بہت جلد اس کی جانب متوجہ کر لیا۔ علم و اخلاق کے مبلغین نے اس کے پردے میں ناآشناؤں کو آشنائے راز کیا۔ جہالت، ظلم اور سماجی ناانصافی کے طوفان پر عقل وذکاوت کے بند باندھے اور لطیفہ بالواسطہ طور پر اصلاح و تربیت کا ذریعہ بن گیا۔

ہمدردی وانسانیت کی جھلکیوں کے ساتھ گہری وابستگی نے تقریر، تحریر، عمل، صوت، حرکات، سکنات کے ذریعہ اس کا اظہار عام سے عام تر کر دیا۔ فنونِ لطیفہ کی یہ شکل رفتہ رفتہ عوام و خواص میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہوئی۔ ان کے لطائف نے زندہ دل بزرگوں کے برجستہ مکالموں کی شیرازہ بندی میں وہی حیثیت اختیار کر لی جو قومی اور ملکی ادب میں لوک گیتوں کی ہو سکتی ہے۔

غیر شائستہ، خلافِ قیاس و اخلاق لطائف ہنوز علمِ سینہ ہی کی پہنائیوں میں غرق رہے۔ خواص اور اہلِ علم تو درکنار عوام کے باشعور و سنجیدہ طبقے میں بھی کبھی انھیں قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی نفی ایک طرف تعلیم یافتہ اور مہذّب طبقے نے کی تو دوسری طرف مذہبی و اخلاقی حلقے بھی ان کی کھلم کھلا مذمت کرتے رہے۔ اسی وجہ سے پست و اخلاق سوز لطائف مجلس و محفل کی کبھی زینت نہ بن سکے اور اس طرح یہ بازار کا گرا ہوا ہار کبھی گلے کی زینت و زیور نہ بن سکا۔ گھروں میں وہی صاف ستھرے اور پاکیزہ لطائف مقبول رہے جو ذکاوت و ذہانت کا مرقع تھے اور جن کے انوکھے پن میں مسکراہٹوں کی بجلیاں اور قہقہوں کے انار تھے۔

چوں کہ لطیفہ گوئی قاری اور سامع دونوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور سبھی کی دل پسند چیز ہے اس لیے

اس کے بارے میں ہرگز دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اچھا مبلغ، مقرر، معلم و سیاست داں بھی وہی سمجھا گیا جو ساتھ ہی اچھا لطیفہ گو بھی ہو، جو نفسِ مضمون، مطلب اور حصولِ خواہش کی خشکی اپنی بذلہ سنجی سے دور کر سکے، اپنی حاضر جوابی کی سامع و قاری سے فی البدیہہ داد حاصل کر سکے۔

یہ بحث بہت پرانی ہے کہ ہم کس چیز کو خلافِ تہذیب کہیں گے اور کس کو تہذیب کے دائرے میں لائیں گے۔ فحش اور غیر فحش کے الفاظ بھی نسبتی ہیں۔ کل تک جو معیوب نہ تھا وہ آج سراپا عیب سمجھا جاتا ہے اور جو آج مستحسن ہے ہو سکتا ہے کل اس کا شمار گناہِ کبیرہ میں کیا جانے لگے۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں، انھیں کے ساتھ فکر و نظر کے پیمانے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم لکھنؤ کے شرفا بے تکلفی سے سر بازار ضلع جگت کرتے، پھبتی کستے، فقرے چست کرتے تھے مگر آج کی تہذیب اس کی روادار نہیں جب کہ یہ بات اپنی جگہ پر طے ہے کہ گذشتہ لکھنؤ کی پرانی تہذیب آج کے مقابلے میں بہت بلند تھی۔ اس کے معیارِ شایستگی کی آج بھی ہم قسم کھا سکتے ہیں۔ یورپ میں سرِ بازار کسی حسینہ کا بوسہ لے لینا یا اس سے بغل گیر ہونا داخلِ اخلاق ہے اور اس کو نظر انداز کرنا بداخلاقی، مگر آج بھی ہماری مشرقی تہذیب میں یہ انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے کی کوشش کرنے والا اخلاقی و قانونی گرفت میں آ جاتا ہے۔

کسی کو خوش کرنا عقلاً و اخلاقاً ایک مستحسن فعل ہے۔ اہلِ ایمان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے۔ لطیفے کو ''مزاح المومنین'' کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور مومن کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ ''مزاح کی کوشش کرتا ہے اور شیریں سخن ہوتا ہے'' خود حضرت علی نے اسے ''حکمت کے نکتوں کا تحفہ'' کہا اور ''اشرف المخلوقات کی پہچان'' قرار دیا کیوں کہ بذلہ سنجی سے عقل پر جلا ہوتی ہے۔

لطیفے کی چار قسمیں ہیں (۱) تبسم آفریں (۲) خندۂ دنداں نما (۳) قہقہے (۴) کثیفے۔

تبسم آفریں لطیفہ کا شمار مزاح یا سنجیدہ ظرافت میں ہے۔ یہ لطیفے کی سب سے اعلا قسم ہے۔ اس کا تعلق دل سے نکلے ہوئے برجستہ فقرے، اچانک واقعے یا خوش گوار حادثے سے ہوتا ہے۔ اس کی تحریک بذلہ سنجی، خوش مذاقی، رمز، طباعی یا کسی تلمیح کے پردے میں ہوتی ہے۔ یہ فطری لطافت مخصوص شخصیات، واقعات، فضا اور ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ ان میں جذبات کی تسکین، مسرت حاصل کرنے اور دوسرے کی ذہانت پر ہنسنے ہنسانے پر مبنی ہوتی ہے۔ غیر معمولی تاریخی شخصیتوں، بے حد ذہین اور فہیم انسانوں، رہنماؤں، فلسفیوں، سیاست دانوں، معلموں، مبلغوں، صحافیوں اور دیو پیکر شخصیتوں کے حالات و واقعات اس قسم

کے دل کش لطائف سے پُر ہیں۔ یہ قطعی بے ضرر ہوتے ہیں اور ساحری کی حد تک انسان کو مسحور کر کے اس کے بچپن کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس طرح عام زندگی بسر کرنے کی قوت ہنسی کی صورت میں نکل کر بچ جاتی ہے۔ مثلاً:

''شاہِ عراق جس وقت گیارہ سال کے تھے اور لندن میں زیرِ تعلیم تھے ایک دفعہ ایک ماہرِ نفسیات نے ان سے کہا'' جب میں بائیسکل پر سوار ہوتا ہوں تو میرے سوچنے کی رفتار دوگنی ہوجاتی ہے۔ شاہ نے جواب دیا'' پھر تو آپ کو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سوچنا چاہیے''

لطیفے کی دوسری قسم خندۂ دنداں نما ہے۔ اس کا شمار مذاق کے ذیل میں ہوتا ہے یعنی چھیڑ چھاڑ، چوٹ کرنے، جملہ چپکانے، فقرہ یا پھبتی کسنے، ضلع جگت یا طنز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں افادیت ہوتی ہے اور خواہش کی تسکین کے لیے کسی پر حملہ کیا جاتا ہے۔ اس میں عدم تسکین کی بچت ہنسی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً:

''آسکر وائلڈ کا ایک ڈرامہ پہلی رات فیل ہوگیا۔ دوسرے دن اس کے دوست نے پوچھا'' کہو یار تمھارا ڈرامہ کیسا رہا؟'' آسکر وائلڈ نے جواب دیا'' ڈرامہ بے حد کامیاب رہا لیکن دیکھنے والے فیل ہوگئے''۔

لطیفے کی تیسری قسم قہقہہ ہے۔ یہ تمسخر کی فہرست میں داخل ہے اور لطیفے کی سب سے خاص قسم ہے جو ظرافت، خوش مذاقی اور طباعی کی پیداوار ہے۔ اس میں خاص چیز اس کا بے ساختہ پن اور انوکھی سادگی ہے جس سے سامع و قاری بے اختیار اور اچانک ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگتا ہے اور یہی ہنسی دراصل ہے اس بچت کی جو ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

''ایک تھیٹر کے مالک نے ایک طوطا پال رکھا تھا جو تھیٹر کے باہر پنجرے میں لٹکا رہتا تھا جب لوگ ٹکٹ لینے آتے تو طوطا کہتا'' باری باری آیئے مہربان، لائن بنایئے مہربان'' اس پر لوگ لائن میں لگ جاتے۔ ایک دن پنجرے کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے طوطا اڑ گیا طوطے کا مالک اسے ڈھونڈھتا ہوا ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کا طوطا بہت سے کوؤں میں پھنسا ہوا ہے اور کوّے اس کو چونچیں مار رہے

ہیں اور طوطا کہہ رہا ہے'' باری باری آیئے مہربان، لائن بنایئے مہربان لائن بنایئے''

لطیفے کی چوتھی قسم کثیفہ ہے دنیا کے لطائف خاص طور پر اردو لطائف عام طور پر اس سے معمور ہیں یہ لطائف کی مکروہ شکل ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ عموماً یہ لطائف اچھی صحبتوں، پاکیزہ محفلوں اور گھروں میں نہیں سنے یا سنائے جاسکتے ان کا تعلق علمِ سینہ سے زیادہ ہے ان کی بنیاد پھکڑ، ہجو، ضلع جگت، عریانی، فحش اور پھبتی پر ہے۔ اس کا اظہار عموماً ہر سال پہلی اپریل کو عملی مذاق کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ جس میں لطیفے کم ہوتے ہیں مگر سنائے اور گڑھے زیادہ جاتے ہیں۔ کثیفے وحشیانہ جذبات و خیالات کے اظہار سے زیادہ قریب ہیں ان میں لطائف کم اور آورد زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً:

''ایک دن ایک طوائف ایک مجلس میں گئی اور اپنا جوتا رومال میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا ایک امیر نے دریافت کیا'' آپ کا جوڑا ابھی آپ کے ساتھ رہتا ہے؟ طوائف نے جواب دیا'' جی ہاں حضور میرا جوڑا تو پاس ہے مگر آپ امیروں کا جوڑا نوکروں کے بغل میں رہتا ہے''

اکثر بے وقوف شخص یا معصوم بچہ بھی لاشعوری طور پر ایسا لطیفہ سر کر دیتا ہے جو ہمیشہ کے لیے ذہن و تاریخ میں محفوظ ہوجاتا ہے لیکن اگر اس بات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو اس واقعے کے تانے بانے کسی ایسے شخص کے غیر معمولی واقعے حال یا خیال سے لاشعوری طور پر مل جائیں گے جس نے اس معمولی ذہن کو حرکت دے کر ایسا غیر معمولی نمونہ پیش کیا۔ ضروری نہیں کہ آپ میرے خیالات سے متفق ہوں مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ زیادہ تر لطائف غیر معمولی شخصیات، واقعات و حالات سے جنم لیتے ہیں یا منسوب ہیں۔ یوں بھی ہمارے آپ کے حلقۂ احباب میں ایسی باغ و بہار شخصیتیں خال خال نظر آتی ہیں جن کی آمد بادِ نسیم سے زیادہ لطیف اور یاد خواب سے زیادہ نشاط آور ہوتی ہے جن کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی ہے اور باوجود اپنی سنجیدگی، تمکنت و وقار کے محفل کو دم بھر میں زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ اس قسم کی شخصیتیں ہر عہد اور ہر دور میں مل جاتی ہیں۔ یہی وہ طاقت ور دماغ ہیں جو لطیفے کے موجد و سرچشمہ قرار دیے جاسکتے ہیں ان کے ذہنی ارتقا و اختراع کا مطالعہ دراصل لطیفے کی تاریخ کا جائزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہی باغ و بہار ٹھوس شخصیتیں اعلا سطح پر جا کر فلسفی، رہنما، مبلغ بھی ہوسکتی ہیں۔ واقعاتی طور پر کسی خاص واقعے، کوئی خاص تشبیہہ، استعارے یا کنایے کے ذریعے دوسرے واقعے سے اس طرح جوڑ کر عام واقعات سے مختلف، انوکھا، اس

کے مماثل یا برعکس ہو جائے اور اصل واقعہ کی تحریف کرے، لطیفے کے اقسام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مخصوص ماحول یا فضا سے بھی لطیفہ جنم پا سکتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمارا موضوع انسان ہے۔ اس کے حادثات، حالات، واقعات، ماحول، سماج اور ان کے آپس کے ٹکراو سے عدم توازن کی صورت میں جو مختصر واقعات رونما ہوتے ہیں وہ اپنے انوکھے پن کی وجہ سے لطیفہ کہلاتے ہیں۔ ہمارا تعلق جمادات نباتات سے نہیں۔ لطیفے کا کسی نہ کسی صورت میں انسان اور اس کے لوازم سے تعلق از بسکہ ضروری ولازمی ہے۔ غیر جاندار اشیاء ہمارے موضوع سے خارج ہیں کیونکہ لطیفے کا زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس کو کسی بھی صورت میں اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جو لطیفہ جتنا زیادہ مشہور اور اچھا ہوگا اتنا ہی سماج کی بڑی سے بڑی اکائی یا عالمی انسانی برادری سے متعلق ہوگا اور اس کی جڑیں سماج اور تہذیب کے باغ میں اتنی ہی زیادہ گہری ہوں گی۔

لطیفے کے بیج اسی زمین میں پھوٹتے ہیں، اسی کی بیل انھیں حالات واقعات و ماحول کے سایے میں پروان چڑھتی ہے۔ وقت اور حالات موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ ان بدلتے ہوئے خیالات کا ٹکراو جدید وقدیم کی شکل میں کسی دور یا کسی بھی زمانے میں سادہ معصوم جذبات کے سہارے شگوفے کھلاتا رہتا ہے۔

لطیفے کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جا سکتا ہے اسی لیے اس کے پلاٹ اور مکالمات کا اتّحادِ عمل اپنے ایجاز کی مدد سے مزاحیہ فضا کی تعمیر کرتا ہے۔ تاثراتی وحدت واندرونی تنظیم کی تکمیل اس اختصار کے ساتھ عمل میں آئے کہ اس کی منزل اتنی مختصر ہو جائے کہ ادھر تار باجا ادھر راگ بوجھا۔ جملوں کی تراش خراش اور برجستگی بھی ابلاغ کے عمل کو تیز تر کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے محاکاتی جلووں میں حسنِ ادا و حسنِ بیان کی پرچھائیاں بھی ہوں تاکہ جملوں کا رکھ رکھاو بہتے ہوئے الفاظ میں ہنسی کے بلبلوں کی صورت میں ظاہر ہو سکے۔ اندازِ بیان، طرزِ ادا، اسلوب وخیال کے عمومی سانچے، سماجی افراد کی ذہنی ساخت ورجحانات سے ہم آہنگ ہوں تاکہ ان لطائف کا تاثر کچھ اور شدید گہرا اور دیرپا ثابت ہو سکے۔ لطیفہ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی دنیا میں جہاں حسن ودل کشی، سرور وسرخوشی رقصاں نظر آئے وہاں سماج کے جن افراد کے لیے یہ پیش کیا گیا ہو وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکیں۔

لطیفہ سنتے ہی بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں اس لیے اس کا براہِ راست تعلق طنز ومزاح سے ہے۔ طنز و

مزاح کسی مزاحیہ کردار، مزاحیہ صورتِ واقعہ، لفظی بازی گری، موازنہ یا تحریف کے رنگ وروپ میں ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس کا تعلق کسی بھی لطیفے میں اس کی کسی نہ کسی شکل یا صورت سے ضرور ہوتا ہے جن کا لطیفے سے بہت ہی نازک تعلق ولطیف فرق ہے اس لیے اس کو ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ کیفیتیں ہیں جن میں لطیفہ بالعموم جنم پاتا ہے۔ مثلاً

''طنز ومزاح، ظرافت، رمز، نغز، طباعی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، مذاق، عملی مذاق، خوش مذاقی، اداکاری، تحریف، تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، تکرار، رعایتِ لفظی، ضلع جگت، مضحک، ہجو، پھکڑ، عریانی، ہزل، زٹل، فحش، پھبتی، آوارہ، طعنہ، فقرہ، فقرہ بازی، جملہ بازی، چوٹ، جلی کٹی''

لطیفہ گو عموماً ظریف ہوتے تھے جو خوبصورت، خوش سیرت خوش قیافہ، خوش بیان، ذہین، دانا، معتدل ہوتے تھے۔ وہ چربہ اتارنے کے فن سے بھی واقف ہوتے تھے۔ وہ لطائف کے پردے میں تاریخی معلومات اور نصیحتوں کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کے اعلا نمونوں سے بھی روشناس کرواتے چلتے۔ مثال کے طور پر درویشوں اور داناؤں کی عقلمندی، خودداری، فیاضی، حق پرستی، عبرت اور عدل کی مثالیں پیش کرتے اور حکایتیں سناتے کیونکہ ان کا سب سے اہم فریضہ پتھر کو موم کرنا ہوتا تھا اور عرض کرنے سے پیشتر جان کی امان پانے کے باوجود جان سخت خطرہ میں رہتی تھی۔ مطلق العنان حکمرانوں کے ندیم ووزیر کی حیثیت سے ان کے اندر روشن خیالی اور توازن پیدا کرنا انھیں عدل کی سیدھی لکیر سے نہ بھٹکنے دینا اور لطیفے کی لاٹھی کے ذریعہ رعایا کے ان گلہ بانوں کو غیر شعوری طور پر ہانک کر دوبارہ راہِ عدل پر لگا دینا ہوتا تھا۔ خارجی و بیرونی مضر اثرات، عدم توازن، بے ڈھنگے پن اور عدم تکمیل پر طنز کر کے وہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے ان کا مقصد اس کے پردے میں عملِ جرّاحی کر کے فساد وفشار دور کرنا بھی ہوتا تھا۔ سولی پر چڑھتے وقت بھی لطیفہ سنانا اسی جرأت وعظمت کی داستان ہے۔

ظریف حاضر جوابیوں کا آئینہ تھے۔ ان کے درمیان جو نازک کلامیاں ہوتیں وہ شاہانِ وقت کو اتنی دیر کے لیے جنگی مہمات، پیچیدہ مسائل، سیاست اور تفکرات کے عالم سے اٹھا کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتیں جہاں بذلہ سنجی کے سرچشمے سے مسرت وذہانت کے سوتے پھوٹتے۔ علم وحکمت کے یہ مہذب جلسے بلا کسی منطقی امداد کے سامعین کو خود بخود اس ذہنی سطح پر لے جاتے جہاں سچی ظرافت اپنے جوہر دکھاتی ہے اور

ایسی ہر صحبت یادگار ہو جاتی ہے۔

ہر دربار اور ریاست سے وابستہ لطیفہ گو ظریف ہوا کرتے تھے جن کا کام تھکے ہارے حکمراں کو اپنے باغ و بہار لطائف کے ذریعہ تازہ کر دینا ہوتا تھا۔ ان درباروں میں جب تعیش کی لہر آئی انھوں نے میدانِ جنگ کے مقابلے میں حرم سرا اور جلوت کے مقابلے میں خلوت کو ترجیح دی تو نہ صرف لطیفہ گوئی کا پیشہ عام ہوا بلکہ ظرفاء کی کثرت نے اس پیشہ کو اس کی سطح سے بہت پست کر دیا۔ عام اور سستے مذاق، پھکڑ، ٹھٹھول اور ابتذال کی کھلی چھوٹ نے ظریف کو مسخرہ، بھانڈ اور لطیفے کو کثیفہ بنا دیا ورنہ لطیفہ گو نہایت کڑھا کڑھایا، ترشا ترشایا ماہرِ فن ہوا کرتا تھا جس کی ذکاوت، ذہانت، علمیت اور سوجھ بوجھ حاضر جوابی، بذلہ سنجی اسے دوسروں سے داد دلواتی تھی۔ بالواسطہ طور پر وہ اتالیق، نگراں یا مشیر کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا جیسے بیربل اور ملاّ دو پیازہ جو محض ظریف نہ تھے بلکہ دربارِ اکبری کے نورتن اور وزیر باتدبیر بھی تھے وہ ملکی معاملات پر ایک ماہرِ سیاست کی حیثیت سے بھی نظر رکھتے تھے۔

لطیفہ گویوں نے بہت سے مجرموں کی خطائیں و سزائیں معاف کرائیں۔ سلاطینِ وقت کی کایا پلٹ کی، بے قصوروں کو محفوظ کیا، مغلوب سرخرو ہوئے، جلا وطن حبِ وطن کے دامن سے ہمکنار ہوئے، بدکرداروں کو نیک بنایا، معزول بادشاہوں کو ان کے ملک واپس دلوائے، خستہ حالوں کو دم بھر میں آسودہ کیا، ان گنت جھگڑے فیصل کروائے، شاہانِ وقت سے بیش بہا صلے پائے۔

تحریر کا فن ایجاد ہونے سے قبل لطائف سینہ بہ سینہ، نسل در نسل چلتے رہے۔ ان کی حد بس زبان تک رہی۔ تحریر کا فن ایجاد ہونے کے بعد بھی عرصے تک لطائف پر توجہ نہیں کی گئی۔ پھر سلاطین و مشاہیر کے حالات و تصانیف میں ان کی جھلک ملنے لگی۔ قدیم ترین کتاب ''حکیم ایسپ کی کہانیاں'' ہے جو اس نے بچوں کے درسِ اخلاق کے لیے جانوروں کی زبان سے بیان کی ہیں۔ عربی میں سب سے پہلے علاّمہ جاحظ ۵۰ھ تا ۵۵ھ اس کی تصنیف ''خود اپنی بات'' کے لطائف قابلِ ذکر ہیں جس کی تقلید میں دوسرے قابلِ ذکر کارنامے وجود میں آئے۔ عربی سے یہ ذوق فارسی میں آیا۔ نظامی سمرقندی نے ۵۴۰ھ میں ''مجمع الانوار'' لکھ کر فارسی ادب میں لطائف قلم بند کرنے کی داغ بیل ڈالی مگر سب سے زیادہ مقبولیت ''مجمع الحکایت'' کو ہوئی اور فارسی میں یہ رواج اتنا جڑ پکڑ گیا کہ ہر تذکرہ و بیاض نگار شعر و ادب کے ساتھ لطائف بھی نقل کرنے لگا۔ ''نفائس الحکایات'' ''مضحکات اور مطائباتِ سعدی'' وغیرہ اس سلسلے کی بے حد اہم کڑیاں ہیں۔ اردو کو یہ مذاق فارسی سے ورثہ میں ملا۔ شروع میں

لطائف نظم ہوتے رہے۔ میر نے فارسی میں لطائف پر ایک مختصر رسالہ لکھا۔ انشا نے لطائف کے دریا بہائے مگر ادبی لطائف کی باقاعدہ ابتدا مرزا غالب سے ہوئی۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ان کے لطائف کو ایک باب کی صورت دی اور مرزا کو حیوانِ ظریف کہا اس وقت سے اردو میں مشاہیر کی سوانح عمریوں میں بھی لطائف کو جگہ دی جانے لگی۔ اسی زمانے میں ''پیامِ یار لکھنؤ'' اور ''پیامِ عاشق'' قنوج'' نامی گلدستے شائع ہوتے تھے جو اپنے لطائف کے لیے مشہور ہیں۔ یہی اہتمام بعد میں ''فتنہ''، ''اودھ پنچ''، ''اَلپنچ'' اور ''اودھ اخبار'' میں بھی ملتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان میں لطیفوں کی دنیا آباد ہے جس میں اس کے اپنے لطیفے کم اور دوسری زبانوں کے زیادہ ہوتے ہیں لیکن ہر زبان میں اکثر ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا مترادف دوسری زبانوں میں نہیں ہو سکتا۔ لطیفہ دراصل عربی کا لفظ ہے جس سے یہ فارسی اور اردو میں آیا۔ انگریزی زبان میں لطیفے کے لیے ہم کو کوئی ایک مخصوص لفظ نہیں ملتا بلکہ Irony,Pleasentry,wit,Mot.Quip,Pun, Humour, joke, اور Satire وغیرہ ملتے ہیں۔ دراصل ان سب کا لطیفہ سے بہت ہی قریب کا تعلق ہے مگر پھر بھی ان سے لطیفے کا مفہوم صحیح طور پر نہیں ادا کیا جا سکتا۔ مغربی لطائف کو ہم اسی عنوان کے تحت تسلیم کرتے ہیں جس سرخی کے ساتھ وہ ہم تک پہنچے ہیں۔

لطیفے کی ابتدائی شکل حکایتوں کی صورت میں ملتی ہے جس میں لطیفے کے پردے میں فیلسوف، بزرگ، درویش، صوفیاء کرام اور وزیرِ دانا شاہانِ وقت اور مریدوں کو ان حکمت اور نصیحت آمیز حکایتوں کے ذریعے راہِ حق پر لگانے کی سعی کرتے۔ اس کی مثال حکیم ایسپ یا لقمان، بقراط، ارسطو، افلاطون، دیو جانس کلبی، بزرگ چمہر، وید بھان، برہمن، جعفر برمکی، شیخ سعدی، شکسپیئر، ڈاکٹر جانسن، ابوالفضل، بیربل، ملاّ دو پیازہ اور نعمت خاں عالی محض ظریف اور لطیفہ گو ہی نہ تھے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان مفکّروں، مبلغوں اور وزیروں کے حکیمانہ نکتوں نے لطیفے کو دربار سے نکال کر مکتب و خانقاہ تک برابر تراشا، سنوارا، نکھارا، انھیں کی بنیاد پر اخلاق و تہذیب نے گلستاں، بوستاں اور انوارِ سُہَیلی جیسے فلک بوس قصر تعمیر کیے۔

آج دربار کے ساتھ یہ فن بھی رخصت ہوا۔ اب کوئی سعادت علی خاں نہیں جو انشاء کے لطیفے سنے، کوئی بہادر شاہ ظفر نہیں جو مرزا کو ان کے حسنِ طلب کی داد دے، وہ باغ و بہار شخصیتیں اب اس قدر عام نہیں کیونکہ اب ان کے قدرداں نہیں۔ یہ سب فراغت کی باتیں تھیں جو بادشاہت، جاگیرداری، زمینداری کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ ارباب نشاط کے ساتھ لطیفہ گو اور لطیفہ گوئی دونوں رخصت ہوئے۔ رنگیلے پیا اور ان کے جانشینوں کی سرپرستی زیادہ

عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ محمود و اکبر جیسے سرپرستوں کے ساتھ ساتھ فردوسی، سعدی، ابوالفضل اور بیربل جیسے ظریفوں کا دور بھی ختم ہوا۔ وزیر اور ندیم کی جگہ مسخرے، بھانڈ اور مفت خورے زیادہ دن نہ رہ سکے۔ انھوں نے آتے ہی اس قدر دھول اڑائی کہ لطیفے کا دامن گرد و غبار سے اٹ گیا۔ اس کی آب اتر گئی، آپ سے ''تم'' اور ''تم'' سے ''تو'' تو تو میں میں اور اس کے بعد عضویاتی مظاہرے ہونے لگے۔ شیخ چلّی کی جگہ شیخ سدّو آئے مگر امساک کھا کے انھوں نے منھ کا مزہ خراب کرا کے ہی دم لیا۔ لطیفہ دربار سے نکل کر بازار میں آیا۔ ضلع جگت اور پھبتیاں اس پر حاوی ہو گئیں۔ ان نوازشات کا یہ اثر ہوا کہ لطیفہ گوئی کا بلند معیار گرنے لگا۔ علماء کی جگہ جہلا نے سنبھال لی۔ اجنبی ہاتھ اسے سنبھال نہ سکے۔ ردِ عمل کے طور پر خواص و عوام کی ذہنی سطح پست ہونے لگی۔ اس کی روشنی میں اگر ہم دہلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ معاشی اور سیاسی زوال نے اس تہذیبی زوال کو اور بھی تیز تر کر دیا۔ دوسری ویسی ریاستیں بھی اس تاریخ کے بہاو سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب، غیر ملکی عمل داری اور دیسی حکومتوں کے خاتمے نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ لطیفہ گوئی کی روشنی میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس عہد کا کیا مذاق تھا۔

بادشاہت کے ساتھ ساتھ لطیفہ گوئی کا عہد بھی رخصت ہوا۔ لطیفہ بازار سے دربار میں واپس نہ جا سکا۔ اب تک عام انسان، تاج و تخت سے علاحدہ کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا لیکن اندرونی آزادی اور جمہوریت اپنے ساتھ آزادی کا پیغام لائی۔ مملوکیت رخصت ہوئی، فرد کی اہمیت سماج میں بڑھ گئی، انفرادی حیثیت سے پھلنے پھولنے کے مساوی حقوق نے شخصی آزادی کو سرسبز ہونے کا موقع دیا۔ شخصی آزادی کے ساتھ ادب و صحافت نے پھر سنبھالا لیا۔ جس کے دامن میں ظرافت نے پناہ لی، بہت جلد وطنِ عزیز پھر ''اودھ پنچ'' کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ اودھ پنچ لطائف کا سرچشمہ ہے۔ اب ظریف اور داستان گو کی جگہ کتب و رسائل نے سنبھال لی۔ ملاّ نصرالدین کو اردو والوں نے شیخ چلّی کے روپ میں پیش کیا۔ عربی والوں کے پاس جاحظ اور فارسی والوں کے پاس ملاّ کا کردار تھا مگر اردو ادب کے میدان میں کوئی نمایاں کردار نہ پیش کر سکا۔ شیخ چلّی، ملاّ جی، حافظ جی، پنڈت جی، لال بجھکّڑ، شیخ جی، خاں صاحب، نواب صاحب، ایلچی، میاں جی کے پردے میں لطائف سماج کی خامیوں پر طنز کرتے رہے۔ کچھ شخصیتیں بھی سامنے آئیں اور کچھ لطائف کتابی صورت میں سامنے آئے۔ عہدِ جدید کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ لطائف کتب و رسائل کی صورت میں محفوظ ہونے لگے۔

اردو ادب میں کلاسیکی لطائف کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ خس و خاشاک کا ایک پہاڑ ہے جس میں کہیں کہیں طنز و مزاح کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں ورنہ زیادہ تر ان کثائف کی آورد ثقالت و عریانیت مذاقِ سلیم پر بار گزرتی ہے۔ ان میں ''گلدستہ پنچ'' ''فتنہ'' ''خندۂ گل'' ''مذاق کا پٹارا'' ''ہنسی کا گول گپّا'' ''دیوارِ قہقہہ'' ''لاحول'' ''شیطان'' ''بیربل'' ''ملاّ دو پیازہ'' ''شیخ چلّی'' ''لطائف و ظرائف'' ''رنگِ ظرافت'' ''غالب کے لطیفے، آبِ حیات کے لطیفے، نوادر چٹکیاں، اور گدگدیاں، ادیبوں کے لطیفے، لطائف الشعراء، اکبر کے لطیفے، سیاہ حاشیے، ملا نصرالدین کے لطیفے اور مجاز کے لطیفے اردو ادب کا ایک گلدستہ ہیں جس میں گُل بھی ہیں گل بھی ہیں۔ بیشتر لطائف آپ کے مذاق و معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان مجموعوں کے ساتھ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ عموماً بیشتر کتب میں تقریباً ایک ہی سے لطیفے معمولی رد و بدل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کا چہرہ ماند و مسخ کر دیا ہے۔ دفتر کے دفتر الٹنے پر بھی بسا اوقات ایک لطیفہ بھی ایسا نہیں ملتا جو علمی و ادبی معیار پر پورا اتر سکے۔ بعض کتب میں خال خال ایسے لطائف مل جاتے ہیں جو روح کو پھڑکا دیتے ہیں۔ ذہانت کو حرکت دیتے اور ہمارے لیے مسرت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

دورِ حاضر اردو لطائف کی تاریخ میں اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں اسے اپنا کھویا ہوا درجہ او روقار رفتہ رفتہ واپس مل رہا ہے۔ اچھے ادبی انتخاب سامنے آ رہے ہیں۔ ادبی رسائل، منتخب رسائل اور بچوں کے رسائل خاص طور پر اچھے اور معیاری لطائف کو زیادہ سے زیادہ اپنے دامن میں جگہ دے رہے ہیں۔

لطیفہ گوئی کی موجودہ صورتِ حال سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل خاصا واضح اور روشن ہے۔ اس میں اصلاح، اضافہ اور ترقی کے امکانات بہت صاف ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی فطری و لازمی ہے۔ زبان کے پھیلاو، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اس میں جو اضافے ہوئے ہیں ان کا معیار آیندہ اور بھی ستھرا اور بلند ہوگا۔

ختم شد